جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

اگست ۱۹۹۵

مدیر: خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

جلد ۱۲۱	اگست ۱۹۹۵ ربیع الاول ۱۴۱۶	عدد ۸

فہرست مضامین

[illegible]

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۔ ۵۴۵۷۰

فون: ۱۲۴ ۔ ۷۵۷

فیکس: ۷۸۳۱۹۴

[illegible]

۵ ۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

فون ۷۵۸۷۹۱۶ ۔ ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۔/۱۲ روپے

زر سالانہ ۔/۱۲۰ روپے

مشرق وسطیٰ ۔/۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط ۔/۴۵۰ روپے

بھارت ۔/۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید ۔/۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۔/۹۰۰ روپے

○

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

شاہ کار: ماہوار مجلہ زیر ادارت جناب مولانا تاجور نجیب آبادی و حضرت راشد ایم اے۔
قیمت: سالانہ چھ روپے۔ دفتر شاہ کار 'مزنگ' لاہور ہندستان کے بلند پایہ ادبی پرچوں میں اس پرچے کا اضافہ حال ہی میں ہوا ہے۔ اردو ادب کی قریب قریب جملہ اصناف کے متعلق چیدہ اور منتخب مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں۔ کسی زبان کے رسالوں اور اخباروں کی ترقی زیادہ تر اہل زبان کے ذوق مطالعہ پر منحصر ہوتی ہے مگر یہاں یہ حال ہے کہ خود ہندستان میں انگریزی رسالوں کی تعداد اشاعت پچاس پچاس ہزار تک پہنچ جاتی ہے' اور اردو رسالوں کو ہزار دو ہزار سے زیادہ خریدار میسر نہیں آتے۔ ایسی حالت میں اردو صحافت کا معیار بلند ہو تو کیسے ہو؟

شریعت: ہفتہ وار: ایڈیٹر محمد صبیب اللہ صاحب بی اے علیگ۔ مقام اشاعت عبداللہ پور ضلع لائل پور (پنجاب) چندہ سالانہ چار روپے حافظ محمد عبداللہ صاحب ممبر لیجسلیٹو اسمبلی کی نگرانی میں یہ نیا اخبار جاری ہوا ہے۔ اسلامی خیالات کی اشاعت اور مسلمانوں کے مفاد کی حمایت اس کا مقصد ہے اور خصوصیت کے ساتھ یہ جس چیز کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا ہے' وہ یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمان رسم و رواج کا قانون چھوڑ کر اسلامی شریعت ہی کو اپنے لیے واحد قانون تسلیم کریں' اور حکومت کو بھی مجبور کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے تمام ان معاملات میں جن کا تعلق (Personal) سے ہے' صرف اسلامی شریعت کو اپنی عدالتوں میں نافذ کرے۔ اس غرض کے لیے حافظ محمد عبداللہ صاحب اسمبلی میں ایک مسودہ قانون بھی پیش کرنے والے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے اس تحریک کی پر زور تائید ہو۔

اخبار مسلمان: زیر ادارت مولوی محمد حنیف صاحب ندوی و عبدالمجید صاحب خادم۔ مقام اشاعت سوہدری ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) چندہ سالانہ چار روپے پچاس پیسے ۔ یہ پنجاب کا پرانا اخبار ہے۔ اب اس نے ایک نیا چولا بدلا ہے۔ جو ہر طرح پرانے سے بہتر ہے۔ مضامین زیادہ تر مذہبی رنگ کے ہیں۔ اور عام مذہبی پرچوں کی طرح ان کا رخ جلال و نزاع کی طرف نہیں بلکہ اصلاح اور دعوت الی الخیر کی طرف ہے۔ پنجاب میں خصوصیت کے ساتھ یہ چیز مغتنمات میں شمار کرنے کے لائق ہے۔ (ا۔م)

(ترجمان القرآن' جلد ۶' عدد ۵' اگست ۱۹۳۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

پاکستان کہاں کھڑا ہے؟

خرم مراد

۱۴اگست کو ہم پاکستان کے یوم آزادی کی ۴۸ویں سال گرہ منا رہے ہیں۔ سال گرہ کا دن جشن سے زیادہ خود احتسابی کا دن ہے۔ اس لیے کہ اس دن امتحان عمل کی جو مہلت سنت الٰہی وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ - کے تحت ہمارے لیے مقرر کی جا چکی ہے وہ ایک سال کم ہو جائے گی' اور ہمارے دفترِ عمل میں ایک سال کے اوراق کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس لیے بھی کہ' سنتِ الٰہی ہی کے تحت 'قومی ترقی و سربلندی' قوت و دولت اور عزت و غلبہ انھی قوموں کا مقدر ہے جو اپنا احتساب آپ کرتی ہیں' اپنی بدعملیوں' غلط کاریوں اور خامیوں کا اعتراف کرتی ہیں' اپنی حالت میں تغیر و اصلاح کے لیے کمربستہ ہو جاتی ہیں' اور اگر مومن ہوں تو اپنے رب کی طرف واپس آتی ہیں:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم کرتی ہے جو' ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نصف صدی کے قریب طویل مہلت کے دوران ہم نے اپنا دفترِ عمل کتنا سیاہ کیا ہے اور کتنا روشن' یہ ہم سے پوشیدہ نہیں۔ اور' اس سفرِ زندگی نے ہمیں کس آگ کے گڑھے پر پہنچا دیا ہے' یہ بھی ہم پر خوب عیاں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ آگ ہمارے اعمال کے ایندھن ہی سے بھڑک رہی ہے: عداوت اور بغض کی آگ' افتراق اور انتشار کی آگ' خون ریزی اور آبرو ریزی کی آگ' غیروں کے آگے ذلت اور اپنوں کے ہاتھوں رسوائی کی آگ۔ هِيَ اَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ عَلَيْكُمْ ' یہ تمھارے اعمال ہی ہیں جو تم کو واپس کر دیے جاتے ہیں۔

آج کا یہ پاکستان' بدقسمتی سے' اس سے مختلف نہیں ہے' جس کی نشان دہی ہم نے ۱۹۹۲ میں کی تھی:

آزادی کی اس سال گرہ کے موقع پر' پاکستان جن سنگین مسائل اور مہیب خطرات سے دوچار

ہے ' ان کی نوعیت [عام نہیں بلکہ] بالکل ہی دوسری ہے ۔ استحکام ' سلامتی اور بقا سب داؤں پر لگے ہوئے ہیں ۔ ہر چیز کے مستقبل پر ' یہاں تک کہ ملک کے مستقبل پر بھی ' بے یقینی کے گہرے کالے بادل چھائے ہوئے ہیں ۔ کل کیا ہو گا ' کوئی یقین کے ساتھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا ۔ لیکن کوئی سنگین سے سنگین بات بھی ایسی نہیں رہ گئی جس کا ہونا ناقابل تصور یا خارج از امکان سمجھا جاتا ہو: سیاسی نظام تلپٹ کیا جا سکتا ہے ' امن و امان تہ و بالا ہو سکتا ہے ' خون ریزی کی آگ بھڑک سکتی ہے ' فوج اور قوم باہم دست بگریبان ہو سکتے ہیں ' ملک لخت لخت ہو سکتا ہے ۔ ملک کی کشتی یقین کے بجائے شک ' امید اور حوصلے کے بجائے یاس و ہراس ' اتحاد کے بجائے افتراق ' اور دیانت و وفا کے بجائے بد دیانتی ' لوٹ کھسوٹ اور بے وفائی کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے"۔
(ترجمان القرآن ' اگست ۹۲ ' ص ۳)

یہ تو قومی زندگی کی مجموعی کیفیت ہے ۔ الگ الگ دیکھیں تو کوئی شعبہ زندگی ایسا نہیں ---- سیاست ہو ' معیشت ہو ' زراعت و صنعت ہو ' تعلیم ہو ' اخلاق و کردار ہو ---- جس میں روز بروز نااہلی ' ناکارکردگی ' لوٹ کھسوٹ ' بگاڑ اور انحطاط میں مسلسل اضافہ نہ ہو رہا ہو ۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ آج ایک پاکستانی دنیا میں کہیں سر اٹھا کر نہیں چل سکتا ' اسے ہر جگہ ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ' اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب ملک کے اندر جو کچھ ہوتا ہے اس پر اس کا دلِ دردمند خون کے آنسو نہ روتا ہو ۔

یہ بگاڑ اور انحطاط کیوں کر پیدا ہوا ہے ؟ اس کا کوئی ایک سبب نہیں ' نہ ساری ذمہ داری کسی ایک عنصر پر ڈالی جا سکتی ہے ۔ لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ اس کے اصل ذمہ دار ہمارے وہ حکمران ہیں جن کے ہاتھوں میں قومی زندگی کا اسٹیرنگ رہا ہے ۔ یہ حالت کوئی ایک دن یا ایک دَورِ حکومت میں بھی نہیں ہوگئی ' نہ صرف آج کے حکمرانوں کو اس کے لیے ملامت کرنا صحیح ہو گا ۔ حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کا یہ عمل روزِ اول ہی سے مسلسل جاری ہے ' اور ' قائداعظم کے بعد ' بلا استثنا کوئی حکمران ایسا نہیں گزرا ہے جس کا دامن پاک ہو ' اور جو آئین و قانون شکنی ' مطلق العنانی ' طاقت کے ناجائز استعمال ' جبر و تشدد ' ہوسِ اقتدار ' قومی مقاصد اور مفادات سے غفلت ' قومی معاملات چلانے میں نااہلی ' غیروں کی غلامی اور ان کے آگے گدائی ' (اور سوائے چند کے) بد دیانتی اور لوٹ کھسوٹ کے ان جرائم کا مرتکب نہ ہوا ہو جن کے نتیجے میں قوم بالتدریج پستی اور بے بس ماندگی کے گڑھے میں گرتی رہتی ہے ۔

کہا جا سکتا ہے کہ ایک قوم کو ویسے ہی حکمران اور لیڈر ملتے ہیں جیسی وہ خود ہوتی ہے ' دودھ میں زہر ہو تو زہریلا مکھن ہی اوپر آئے گا ۔ یقیناً عام لوگوں کو ان کی ذمہ داری سے بَری نہیں کیا جا سکتا '

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ۴۸ سال تک ان حکمرانوں کو لانے اور نکالنے میں ان کی آزاد مرضی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں رہا' اور ۱۹۸۸ سے بھی جو تھوڑا بہت اختیار انھیں ملا ہے' وہ کئی سمتوں سے دباؤ اور سازباز کا شکار رہا ہے۔

یہی پاکستان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔جن جاگیرداروں' فوجی جرنیلوں اور افسروں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ رہی ہے' سید مودودی کے الفاظ میں' انھیں: "کوئی ایسی تعلیم و تربیت نہیں ملی ہے جس نے ان میں کوئی قومی کیرکٹر پیدا کیا ہو۔ انھیں اپنے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ وہ بڑے مہذب لوگ ہیں' حالانکہ تہذیب محض انگریزی بگھارنے اور انگریزوں کے سے کپڑے پہننے اور انھی کی طرح رہنے سہنے کا نام نہیں ہے' بلکہ آئین و قانون کی پابندی' نظم وضبط اور اپنے حدود کو سمجھنے اور ان سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔ اور اس اعتبار سے [اکیسویں صدی کی دہلیز پر پہنچنے کے باوجود] ابھی یہ لوگ تہذیب کے اس مقام تک نہیں پہنچے ہیں جس پر اٹھارویں صدی کے وسط میں انگریز قوم کا ایک معمولی ٹامی فائز تھا"۔

تفصیل کی گنجایش نہیں' لیکن قومی زندگی کے بعض اہم دائروں میں ان حکمرانوں کے کردار اور کارکردگی کا مختصر سا جائزہ اس بات کی حقیقت واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔

ہر ملک میں مختلف گروہوں کے مفادات و مقاصد کے درمیان تصادم سے سیاسی بحران پیدا ہوتے ہیں' اور بعض دفعہ وہ پوری قوم کو بھی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ لیکن حکمران ہی انھیں حسن تدبیر سے حل کرتے ہیں۔ مگر پاکستان کے حکمران جب کسی سیاسی بحران سے دوچار ہوئے' یا جسے انھوں نے اپنے اقتدار کے لیے خطرہ دیکھ کر بحران بنالیا' اسے انھوں نے حل کرنے کے بجائے اپنی نااہلی' بے تدبیری اور غلط کاری سے مزید بگاڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر بحران نے ایک سنگین تر بحران کو جنم دیا' اور ہر بحران قوم کو تلخ سے تلخ تر نتائج کا تحفہ دیتا گیا' نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۷۱ میں ۱۹۴۷ کا پاکستان دو ٹکڑے ہو کر ختم ہو گیا' اور آج ۱۹۹۵ میں نیا پاکستان بھی سیاسی اور نسلی تصادم اور محاذ آرائی کے ایک بظاہر لاینحل بحران کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قائداعظم کے جانشین اخلاص و بے لوثی' فہم و فراست اور تدبر و تحمل کی ان صفات سے محروم تھے جو ان بحرانوں کو حل کرنے کے لیے ضروری تھیں۔ اس پر مستزاد' وہ ہر قیمت پر طاقت سے چمٹے رہنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہر مخالفت و اختلاف' ہر سیاسی عمل اور ہر جمہوری ادارے کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھا۔ چنانچہ جب کوئی بحران پیدا ہوا' انھوں نے 'سیاست کاری کے

سارے اصول بالائے طاق رکھ کے ' صرف طاقت کے بل پر ان کو ختم کرنا چاہا: عام قانون کی طاقت ' وہ ناکافی تھی تو من مانے قانون کی طاقت ' اس سے بھی کام نہ بنا تو قانون شکنی کر کے لاقانونیت کی طاقت ۔ اسی طرح انتظامیہ اور پولس کی قوت بھی استعمال کی ' اور فوج کی قوت بھی 'کبھی پس پردہ اور کبھی کھلم کھلا مارشل لا اور فوج کشی کی صورت میں ۔

بحران کے حل میں طاقت کا ایک مقام ضرور ہے: سیاست کاری کی پشت پر طاقت کا موجود ہونا ضروری ہے ' اور بعض حالات میں طاقت کا استعمال بھی ناگزیر ہو سکتا ہے ۔ لیکن تجربہ یہی ہے کہ طاقت سے جنگ تو لڑی جا سکتی ہے ' بحران حل نہیں ہوتا اور فتح بھی یقینی نہیں ہوتی ۔ ایک آزاد ملک کے آزاد باشندوں کے ساتھ نہ جنگ لڑنا مطلوب ہو سکتا ہے ' نہ ان کو مفتوح بنانا ۔ پھر طاقت کے کارگر ہونے کے بارے میں سارے دل خوش کن اندازے بھی بالعموم غلط نکلتے ہیں ' مطلوبہ نتائج بھی شاذ و نادر ہی بر آمد ہوتے ہیں ۔ بحران اور تصادم بڑھتا ہی ہے ' اندرونی ہو یا بین الملکی ۔ کوریا ' ویت نام ' بیروت صومالیہ ' الجیریا ' کینیا ' آئرلینڈ ' فلسطین ' بوسنیا ' چیچنیا ' مشرقی پاکستان ' بلوچستان ۔۔ تاریخ ' ناکامی کے تجربات سے بھری ہوئی ہے ۔

طاقت کے استعمال سے مفر ممکن نہ ہو ' تو اس کے کارگر ہونے کا کچھ امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ صحیح وقت پر استعمال ہو ' صحیح لوگوں کے خلاف ہو ' صحیح مقدار میں ہو ' عدل و شفقت کے ساتھ ہو ' اور جلد از جلد اپنے اہداف حاصل کر کے اسے ختم کر دیا جائے ۔ اس کے ساتھ ساتھ دل جیتنے ' شکایات دور کرنے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے موثر اقدامات بھی ضروری ہیں ۔ ڈھاکہ میں ان تمام اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ' اب کراچی میں بھی وہی غلطیاں دہرائی جا رہی ہیں ۔

بحران کو حل کرنے کا مسلمہ اصول یہی ہے کہ طاقت کی منطق کے بجائے ڈپلومیسی کی منطق کو ہمیشہ ترجیح دی جائے اور مذاکرات ' افہام و تفہیم اور اتفاق رائے سے قابل قبول حل تلاش کیے جائیں ۔ جہاں حکومت شہریوں کی ہو ' شہریوں کے لیے ہو ' اور سب شہریوں کے حقوق مساوی ہوں ' وہاں طاقت کے استعمال کا جواز مشکل ہی سے نکل سکتا ہے ۔ خوارج حضرت علیؓ کی تکفیر کرتے تھے ' برملا آپ کو قتل کرنے کی بات کرتے تھے ۔ لیکن آپ یہی فرماتے کہ جب تک وہ میرے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتے میں نہیں اٹھاؤں گا ' اور جب تک وہ قتل کے جرم کا ارتکاب نہیں کرتے میں انھیں سزا کیسے دے دوں ۔ سیاست کاری اور مذاکرات کی کامیابی کے لیے تحمل ' وسیع الظرفی ' نیک نیتی اور لین دین ضروری ہوتا ہے ۔ مفاہمت و مذاکرات کا ایک خاص وقت ہوتا ہے ۔ مفاہمت کا رویہ نہ ہو اور وہ وقت گزر جائے تو تلخ نتائج یقینی بنتے جاتے ہیں ۔ ان دونوں ضروریات کا ادراک بھی ہمارے ہاں مفقود رہا ہے ۔ کراچی

کا حالیہ بحران ' درج بالا تمام پہلوؤں سے موجودہ حکمرانوں کی نااہلی اور بے تدبیری کا منہ بولتا نمونہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے معاملے کی تدبیر بھی اسی انداز میں کی گئی۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کا مسئلہ کسی بھی فیڈریشن میں ایک بحران بن سکتا ہے۔ پاکستان کے جغرافیے 'لسانی اور نسلی تقسیم اور فوج اور بیوروکریسی میں ایک طبقے کے غلبے کی مخصوص نوعیت نے اس مسئلے کو ایک بارود کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو اس کا کوئی ادراک نہ تھا۔

فروری ۴۸ء میں بنگالی کو سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ دستور ساز اسمبلی میں اٹھایا گیا۔ لیاقت علی خاں نے ' اس مطالبے کو تفرقہ اندازی قرار دیتے ہوئے ' اعلان کیا کہ اردو ہی قومی زبان ہوگی ' قائداعظم نے یہی اعلان مارچ میں ڈھاکہ میں دہرا دیا ' خواجہ ناظم الدین نے فروری ۱۹۵۲ میں ڈھاکہ میں پھر اس کی تکرار کر دی۔ کسی نے اس پر بات چیت کی ضرورت نہ سمجھی۔ اردو تو آج تک سرکاری زبان نہیں بن سکی ہے ' لیکن بنگالی کے حق میں تحریک شروع ہوگئی ' مظاہرے ہوئے ' اس تحریک کو بحران بنا لیا گیا ' لاٹھی ' گولی اور جیل سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ' لاشیں گریں ' شہید مینار تعمیر ہو گیا ' اور بالآخر ۱۹۵۴ میں ' ۶ سال بعد ' بنگالی کو ایک قومی زبان کے طور پر تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن اس پورے عمل نے بنگالی قومیت اور علیحدگی کی تحریک کی بنیاد رکھ دی۔

۱۹۵۴ میں مشرقی پاکستان کے انتخابات میں مسلم لیگ کو عبرت ناک شکست ہوئی اور یونائیٹڈ فرنٹ کی حکومت قائم ہوگئی۔ حکمرانوں کے لیے یہ بھی ایک بحران تھا۔ چنانچہ چند ہی ماہ میں سکندر مرزا کو گورنر لگا دیا گیا ' وزارت کو برطرف کر دیا گیا ' وزیراعظم محمد علی بوگرہ نے فضل الحق کو غدار قرار دیا — "وہ علیحدگی کے لیے سازشوں میں مصروف تھے"۔ اخباروں پر سنسر لگا دیا گیا ' بڑے پیمانے پر لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ فضل الحق پہلے مرکزی وزیر داخلہ اور پھر گورنر بنے ' سہروردی وزیراعظم بنے ' مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا جذبہ بھی مزید مستحکم ہو گیا۔

مرکز میں مقتدرین کے درمیان تقسیم اختیار کا مسئلہ بھی ۱۹۵۳ سے ۱۹۹۳ تک مسلسل ایک بحران بنا رہا ہے۔ یہ مسئلہ ' مشرقی پاکستان کے ساتھ تقسیم اختیارات کے مسئلے کے ساتھ خلط ملط ہو گیا۔ ان مسائل کو مفاہمت کے ذریعے حل کرنے کے بجائے ' فوج اور بیوروکریسی کی قوت کے بل پر ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا گیا ' پھر ۱۹۵۴ میں دستور ساز اسمبلی ہی کی بساط لپیٹ دی گئی ' اور بالآخر ۱۹۵۸ میں ۱۹۵۶ کا دستور منسوخ کر کے فوج بالکل سامنے آگئی۔ سیاسی عدم استحکام کے علاج کے نام پر کیے جانے والے اس اقدام کے نتیجے میں عدم استحکام تو آج تک بد سے بدتر

ہی ہوتا گیا ہے' ہاں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا۔ اس کے باوجود' ۱۹۶۹ء کے بعد بھی' اور ۱۹۷۱ کے انتخابات کے بعد بھی' شدید ترین بحران کے باوجود' مذاکرات و مفاہمت سے پاکستان کو ایک رکھنے کی راہ نکل سکتی تھی اور ہم بربنائے شواہد یقین رکھتے ہیں کہ بنگالیوں کی بھاری اکثریت پاکستان سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھی' لیکن اس بحران کو حل کرنے کے لیے بھی ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کو مشرقی پاکستان پر فوج کشی کر دی گئی۔ اس فوج کشی کے ملبے کے نیچے ۱۹۴۷ کا ۲۵ سالہ جوان رعنا پاکستان ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔

سیاست مسلسل بحران کا شکار اس لیے ہے کہ ہر حکمران نے اپنے اقتدار کی ہر مخالفت کو تفرقہ انگیزی اور ملک دشمنی قرار دیا' مخالفین کو غدار قرار دیا' اور ان کے استیصال کے لیے ہر قسم کے قانونی اور غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کیے۔ مگر بالآخر سب خود ہی غیر قانونی ذرائع کا شکار ہو کر رخصت ہو گئے اور خود ساختہ "بحران" اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ ایوب خاں بڑے طمطراق سے آئے' سارے سیاست دانوں کو سیاست بدر کیا' پھر اپنی پارٹی بنائی' مگر جب عوامی مخالفت کی لہر اٹھی تو حوصلہ ہار دیا' ۱۹۵۶ کے اس دستور کو ضمیر کی ادنیٰ سی خلش کے بغیر توڑ چکے تھے جس کی وفاداری کا حلف اٹھایا' اب اپنے ہی بنائے ہوئے دستور کو توڑا' حکومت فوج کے سپرد کر دی۔ جنرل ضیاء الحق ۹۰ دن میں انتخابات کرا دینے کا وظیفہ پڑھتے ہوئے آئے مگر دس سال جمے رہے' اپنے اقتدار کی خاطر اس حد تک گئے کہ "ووٹ اسلام کو دو' منتخب پانچ سال کے لیے ضیاء الحق ہو جائے گا"۔ بھٹو کو پھانسی ہوئی اور طاقت کے ذریعے پیپلز پارٹی کے "بحران" کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی' لیکن بالآخر خود طیارے کی تباہی میں گئے' اور ان کے جاتے ہی پیپلز پارٹی فوراً برسر اقتدار آگئی' اور آج بھی ہے۔

پاکستان کے حکمرانوں کے اس طرز عمل کے پیچھے ان کی نفسیات' سوچ اور رویوں کے سرچشموں کا کھوج لگانا کچھ مشکل نہیں۔ یہ بالعموم جاگیردار و سرمایہ دار تھے' یا فوجی جنرل اور سرکاری افسر۔ جو جاگیردار تھے' انھیں جاگیریں انگریز کی وفاداری' اس کے ساتھ مل کر نافرمان رعایا کو کچلنے اور انگریزی فوج کی توپوں کے لیے جوانوں کا چارا فراہم کرنے کے صلے میں ملی تھیں۔ ان کی عزت و ذلت انگریزی افسر کے دربار میں کرسی کے مقام اور اس کی طرف سے سند تعریف اور خطابات سے وابستہ رہی تھی۔ یہ خود کو اپنی جاگیر کی زمین' پیداوار' مزارع' اس کی بیوی اور بہو بیٹی کا مطلق العنان مالک سمجھتے تھے' ان کی جاگیر میں ان کی مرضی' ان کا لفظ ہی قانون ہوتا تھا' وہ اپنی جاگیر کو جس طرح چاہتے تھے لوٹ سکتے تھے۔ اسی نفسیات و کردار کے ساتھ انھوں نے پاکستان کی حکومت سنبھالی اور سوچا کہ پاکستان کی صورت میں اب ان کو ایک بڑی جاگیر مل گئی ہے۔ فوجی جرنل بھی صرف "یس سر" سننے کے عادی ہوتے تھے' ان

کے ماتحتوں کے لیے ان کا ہر لفظ قانون ہوتا تھا' انھیں ہر مسئلے کو ایک حکم جاری کر کے حل کرنے کی تربیت ملی تھی' مطالبے اور اختلاف اور حکم عدولی کا تصور بھی ان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اور ایسی ہر "بغاوت" کا علاج ڈسپلن کرنا اور کورٹ مارشل کرنا ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے پاکستان کے معاملات کو بھی اسی انداز میں چلایا۔ چنانچہ معاملات بگڑتے گئے' اور آج ایک اور ربع صدی کے بعد' ہم اپنی تاریخ کے ایک اور خوف ناک بحران سے دوچار ہیں۔

قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں غفلت' نااہلی اور مفاد پرستی کی وجہ سے جس درجے کی بدتدبیری (mismanagement) کی گئی ہے' وہ ایک دوسری داستان عبرت ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لیے پورا دفتر کھولنا ہوگا۔ لیکن ہم صرف تین شعبوں میں جو نتائج نکلے ہیں وہ سامنے رکھیں گے۔ دیگ کے یہ چاول ساری دیگ کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ تعلیم: تعلیم کا جائزہ سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک تعلیم ترقی اور استحکام کی کلید اور بنیاد ہے۔ تعلیم صحیح ہو تو وہی اخلاق و کردار کی تعمیر کی ضمانت ہے' اور قوم کی امنگوں اور مزاج کی آئینہ دار ہو تو اس کے قبلے کو صحیح رخ پر رکھنے کا ذریعہ۔ بدقسمتی سے سب سے زیادہ تغافل' مجرمانہ تغافل' تعلیم ہی سے برتا گیا ہے۔ ایک کے بعد ایک رپورٹوں کے باوجود' اس کا قبلہ اور نہج درست نہیں ہوا۔ معیار روز بروز گر رہا ہے۔ اس نے قوم کو دو حصوں میں پھاڑ رکھا ہے۔ غیروں کے پیمانوں سے نتائج ناپیے' تو ایک الم ناک تصویر بنتی ہے:

۴۸ سال کی کوشش کے بعد بھی ہم صرف ۳۵ فی صد آبادی کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا سکے ہیں' عورتوں میں یہ تناسب صرف ۲۰ فی صد ہے۔ اس کے مقابلے میں بھارت میں یہ تعداد ۴۸ فی صد' ملائیشیا میں ۷۸ فی صد' اور سعودی عرب میں بھی ۶۲ فی صد ہے۔

لازمی تعلیم کا خواب پورا ہونے کا امکان تو دُور دور نہیں' ابھی تک نصف سے زیادہ بچے (۵۴ فی صد) پرائمری میں داخل ہی نہیں ہوتے' ہونا چاہیں تو ان کے لیے اسکول ہی نہیں ہیں۔ جو بچے اعداد و شمار کی رُو سے اسکول جاتے ہیں' ان کے نصیب میں کیسے اسکول ہیں؟ دیہاتوں میں' جہاں ۷۰ فی صد آبادی رہتی ہے' ۴۰ فی صد پرائمری اسکول بغیر عمارت کے ہیں' جبکہ سندھ میں ایسے اسکول ۵۵ فی صد ہیں۔ پنجاب میں کم از کم ۲۰ ہزار اسکول بغیر عمارت کے' اور ۱۵ ہزار صرف ایک کمرے پر مشتمل ہیں۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق پنجاب میں ۹۵ فی صد پرائمری اسکولوں میں صرف ۲ اساتذہ ۵ جماعتوں کو پڑھاتے ہیں' جبکہ سندھ میں ۵۶ فی صد سنگل ٹیچر اسکول ہیں۔ اس کے علاوہ "اسکولوں کی

ایک کیمپ وہ ہے جو صرف کاغذوں پر موجود ہے' جن میں طلبہ غائب ہیں 'مگر اخراجات مسلسل ہو رہے ہیں۔ جب حال یہ ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ جن ۶۴ فی صد بچوں کا پرائمری میں پڑھنا شمار ہوتا ہے' ان میں سے ۳۹ فی صد ایک سال بعد ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں' اور پانچویں کلاس تک مشکل سے صرف ۴۰ فی صد پہنچتے ہیں۔

مڈل اور ہائی اسکولوں کی حالت کچھ بہتر ہے' مگر ان کی تعداد پرائمری کی صرف ۱۴ فی صد ہے۔ چنانچہ اسکول جانے کے مستحق بچوں کی تعداد اگر ۱۰۰ ہے' تو مڈل اسکول میں صرف ۲۳ اور میٹرک میں صرف ۱۷ پہنچتے ہیں۔ ان میں سے ۵۰ فی صد میٹرک میں فیل ہو جاتے ہیں' ۷۰ فی صد انٹر میں' اور جو بچے کھچے تین چار طالب علم ڈگری لینے پہنچ جاتے ہیں' ان میں سے بھی ۷۰ فی صد بی اے' بی ایس سی میں فیل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے پاکستان میں ڈگری کے لیے پڑھنے والوں کی تعداد ایک لاکھ آبادی پر صرف ۲۶۶ ہے' جبکہ یہی تعداد ایران میں ۸۵۸' عراق میں ۱۲۴۰' ملایشیا میں ۶۷۹' انڈونیشیا میں ۸۵۸ اور سعودی عرب میں بھی ۱۰۳۵ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ۱۲ کروڑ کی آبادی والے پاکستان کی ساری جامعات میں ایک لاکھ طلبہ بھی نہیں ہیں۔

اتنے شرم ناک نتائج کسی صنعت کے ہوں تو اسے فوراً بند کر دیا جائے گا۔ تعلیمی اداروں کو بند تو نہیں کیا جاسکتا' لیکن کیا اس صورت حال کے ذمہ دار حکمرانوں کو بدلنا ناگزیر نہیں ہے؟

۲- زراعت: زراعت معیشت کا سب سے اہم شعبہ ہے' اس پر توجہ سب سے کم ہے۔ اگر زراعت کی اور دیہی آبادی کی ترقی کے لیے مناسب اور کماحقہ اقدامات کیے جاتے تو آج ملک معاشی طور پر خود کفیل اور مضبوط ہوتا۔ ہمارے پاس زرخیز زمین' وافر پانی اور محنتی دہقان ہے' لیکن ہمارے حکمرانوں نے آنکھ بند کر کے مغرب کے معاشی ترقی کے ماڈل کے پیچھے دوڑ لگا دی' اندر سے بھی سرمایہ کھینچا' باہر سے بھی مانگا یہاں تک کہ بال بال قرض میں جکڑ گیا' لیکن سب کچھ صنعت میں لگا دیا۔ چنانچہ زراعت کی حالت زبوں سے زبوں تر ہوتی گئی۔

آج بھی ۷۰ فی صد آبادی اور ۶۰ فی صد سے زیادہ لیبر فورس دیہاتوں میں رہتی ہے۔ زراعت کا شعبہ براہ راست اور بالواسطہ ۷۵ فی صد زرمبادلہ کماتا ہے' لیکن اس کی زبوں حالی کی وجہ سے ہمیں ۳۲ ارب روپے کا غذائی مواد درآمد کرنا پڑتا ہے' جو بچ سکتا تھا۔ اس کے باوجود' پنج سالہ منصوبوں میں زراعت کا حصہ ۹.۵ سے گھٹتے گھٹتے اب ۳.۵ فی صد رہ گیا ہے اور مزید برآں ۱۹۸۱ تا ۱۹۹۰ کی دہائی میں ۵۶ ارب روپے کے وسائل زراعت سے کھینچ کر دوسرے شعبوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔

اگر ہم پاکستانی پنجاب کا موازنہ بھارتی پنجاب سے کریں' تو ہمارے ناخداؤں کی نااہلی بے نقاب

ہو جاتی ہے۔ہمارا رقبہ ایک کروڑ ستر لاکھ ہیکٹر ہے 'ان کا ۵۶ لاکھ 'ہمارا ۷۱ فی صد رقبہ زیر کاشت ہے' ان کا ۸۴ فی صد' ہماری ۸۵ فی صد کاشت کی آبپاشی ہو رہی ہے 'ان کی ۹۴ فی صد کی' ہمارے پاس ڈیڑھ لاکھ ٹریکٹر ہیں' ان کے پاس تقریباً دگنے 'یعنی پونے تین لاکھ' ہمارے ہاں ۲ لاکھ ۸۳ ہزار ٹیوب ویل ہیں' ان کے ہاں یہ بھی دگنے 'یعنی ۷ لاکھ ۷۳ ہزار' ہم ۴۰ تا ۵۰ فی صد دیہاتوں تک بجلی پہنچا سکے ہیں وہ ۹۴ فی صد تک' ان کے ہاں پختہ سڑکیں بھی ہم سے دگنی ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ تین گنا رقبے کے باوجود' ہم ۵۷ لاکھ ہیکٹر زمین کاشت کر کے صرف ایک کروڑ پانچ لاکھ ٹن گندم پیدا کرتے ہیں' وہ ۳۲ لاکھ ہیکٹر سے ایک کروڑ بیس لاکھ ٹن' ہم ۱۲ لاکھ کے رقبے سے ۱۴ لاکھ ٹن چاول حاصل کرتے ہیں' وہ ۱۹ لاکھ کے رقبے سے ۷۰ لاکھ ٹن۔چنانچہ ہم ہر سال ۸ ارب روپے خرچ کر کے ۲۰ لاکھ ٹن گندم درآمد کر رہے ہیں' اس کے برعکس بھارتی پنجاب پورے بھارت کو گندم فراہم کر رہا ہے' اور بھارت کے پاس تین کروڑ بیس لاکھ ٹن کا ذخیرہ ہے۔اگر ہماری گندم کی صرف پیداوار بھارتی پنجاب کے برابر ہوتی تو ہمیں ۲۰ لاکھ ٹن درآمد نہ کرنا پڑتی' ہمارے پاس ۷ لاکھ ٹن فاضل ہوتی۔

ہمارے دریاؤں کے سرمائی پانی کا ۲۵ فی صد ضائع ہو رہا ہے۔ ۱۲۵ ملین ایکرفیٹ پانی ہم آب پاشی کے لیے فراہم کر رہے ہیں' اس کا صرف ۵ فی صد استعمال ہوتا ہے۔ہمارا آب پاشی کا نظام تباہ حالی کا شکار ہے۔ہمارے پاس ۹۰ لاکھ ہیکٹر قابل کاشت زمین ہے جس پر کچھ نہیں پیدا ہو رہا' اس کی آب پاشی ہو سکتی ہے۔ہمارے ہاں کھاد کا استعمال ۱۰۴ کلو فی ہیکٹر ہے' جبکہ چین میں یہ ۳۳۰ کلو' اور بنگلہ دیش میں بھی ۱۱۱ کلو ہے لیکن ہم نے ورلڈ بنک کے اصرار پر کھاد کی قیمتوں میں امداد ختم کر دی ہے' جبکہ بھارت نے اپنے بجٹ میں ۵۴ ارب روپے اس مقصد کے لیے رکھے ہیں۔

۳۔ دفاع: تعلیم اور غذا کے بعد' ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ اپنی سلامتی کے تحفظ کا ہے۔ ہم۔۔۔ تعلیم 'صحت' زراعت 'صنعت' رسل و رسائل 'سب کا پیٹ کاٹ کر' دفاع پر اپنی آمدنی کا نصف حصہ خرچ کرتے رہے ہیں۔لیکن نتائج کیا ہیں؟

۱۹۷۱ میں ہم ملک کی سلامتی کے تحفظ میں بری طرح ناکام ہوئے' اور آدھا پاکستان کھو دیا' ہماری ۹۰ ہزار فوج نے پوری طرح لڑے بغیر بھارت کے آگے ہتھیار ڈال دیے 'مغربی پاکستان بھی امریکہ کی مداخلت کی وجہ سے بچا۔ہماری اسٹرے ٹیجی غلط مفروضوں اور خوش فہمیوں پر مبنی تھی ہم سمجھتے تھے کہ ہندستان ہم پر حملہ نہیں کرے گا' کرے گا تو ہم نپٹ لیں گے 'چین ہماری مدد کو آئے گا' مقامی آبادی ہمارے قابو میں آسکے گی۔

مشرقی پاکستان کے دفاع کے لیے ہماری مستقل حکمت عملی بھی سخت بے بصیرتی پر مبنی رہی۔کمانڈر

انچیف ایوب خان سمجھتے تھے کہ ''اگر ہم مشرقی پاکستان میں اپنی تمام فوجی طاقت جمع کر دیں' تو بھی اس کا دفاع ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں مغربی پاکستان میں اپنی فوجی قوت کو مضبوط سے مضبوط بنانا چاہیے'' (ڈان' ۱۸ جنوری ۱۹۵۵)۔ اس سوچ کا نتیجہ تھا کہ قیام پاکستان کے ۲۵ سال بعد جب فوج کی ضرورت پڑی ---- وہ بھی اپنے شہریوں کے خلاف ---- تو مشرقی پاکستان میں ہمارے پاس کوئی بحریہ نہ تھی' اور صرف ایک ڈویژن انفنٹری' ایک اسکواڈرن ہوائی جہاز اور ایک ہوائی اڈہ تھا۔ حالانکہ مشرقی پاکستان میں ہر قدم پر ایک بی آر بی نہر تھی' اسے ناقابل تسخیر بنایا جاسکتا تھا' بلکہ وہ مغربی پاکستان کی مدد کر سکتا تھا۔ ۱۹۶۵ میں بااثر بنگالی روتے تھے کہ ہمارے پاس دو ڈویژن رائفل بردار فوج بھی ہوتی تو ہم آسام کو ہندستان سے کاٹ سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے مشرقی پاکستان کو کھو دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگرچہ صحیح دفاعی حکمت عملی' مستقل یا وقتی' غلط سیاسی حکمت عملی کا مداوا نہیں کر سکتی تھی' لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ۱۹۵۲ سے ۱۹۷۱ تک دونوں حکمت عملیاں دو جنرلوں کے ہاتھوں میں تھیں۔

کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ اگر ہم اسے ۱۹۴۸ میں نہ لے سکے تو ایک حد تک قابلِ فہم ہے۔ لیکن ۱۹۶۲ میں' جب چین نے ہندستان پر حملہ کیا تھا' ہم نے امریکہ کے بھرے میں آکر اسے حاصل کرنے کا ایک زریں موقع کھو دیا۔ ۱۹۶۵ میں ہم نے ایک بے سوچا سمجھا اقدام کیا' اور اسی لیے ۱۷ دن بعد سیز فائر قبول کرنا پڑا۔ آج بھی مجاہدین تو جان و مال اور آبرو کی بے مثال قربانیاں دے رہے ہیں' خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں' اور ہم ان تک مناسب امداد پہنچانے میں ناکام ہیں۔ اگر مجاہدین ناکام ہوگئے تو ہمیں کشمیر کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہوگا۔

بھارت ہمارا اصل دشمن ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان فوجی اور صنعتی طاقت میں مہیب تفاوت پیدا ہو چکا ہے۔ اس کا کیا حل ہے؟ دفاع' اب نیوکلیر صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں' لیکن ہم امریکی دباؤ میں اپنی افزودہ یورینیم کی پیداوار منجمد کر چکے ہیں۔

یہ خوفناک صورت حال' یہ مہیب مسائل' یہ جڑیں نہیں' شاخیں ہیں۔ اصل مرض' اور اصل بحران ایک ہی ہے: قومی کیرکٹر اور ایمان و اخلاق کا بحران ---- سید مودودی کے الفاظ میں: ''آپ برا نہ مانیں تو کہوں ---- ہم نے ۱۹۴۷ میں آزادی حاصل تو کر لی' مگر ہمارے اندر قومی حیثیت سے وہ ابتدائی اوصاف بھی پیدا نہیں ہوئے' جن کی بدولت کوئی قوم اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے''۔ بلکہ' وائے ناکامی! نہ صرف یہ کہ آج تک پیدا بھی نہیں کر سکے' جو تھوڑا بہت متاعِ کارواں تھا وہ بھی جاتا

رہا اور کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی جاتا رہا۔ صدر ' وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف سے لے کر تھانے دار ' پٹواری ' لائن مین اور میٹر ریڈر تک ' سب کھلم کھلا قانون شکنی کرتے ہیں ' بدعنوانی کرتے ہیں ' لوٹ کھسوٹ مچاتے ہیں ' کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ۔ بغیر ایمان و اخلاق کا سرمایہ جمع کیے ' اور بغیر اس کے کہ قوم بیدار ہو کر اپنی حالت کی اصلاح خود کرے ' ہمیں یقین کامل ہے کہ صورت حال میں کوئی بہتری پیدا نہ ہوگی ۔

ہم ہزار مرثیے پڑھیں ' ہزار نسخے تجویز کریں ' کوئی علاج ممکن نہیں جب تک قوم کو یہ یقین مضطرب نہ کر دے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ناقابل قبول ہے ' اسے بدلنا ناگزیر ہے ' اور یہ صورت حال صرف ہمارے بدلنے ہی سے بدلے گی ' کوئی مرد ازغیب ' کوئی معجزہ ' کوئی حسن اتفاق ' نظام میں کوئی تبدیلی ' اس صورت حال کو بدلنے میں کامیاب نہ ہوگی ۔ اس تبدیلی کی بنیاد اور نقطہ آغاز ' ایمان اور اخلاق کے علاوہ کچھ نہیں ۔ نہ سیاسی مفاہمت سے یہ بحران مستقل حل ہوگا ' نہ سرمایہ کاری سے ' نہ چہروں کی تبدیلی سے ۔ پھر وہ اسی ایمان و اخلاق کی آرزو اور جستجو میں کوشاں ہو جائے ۔

ایمان ایک قبلے اور ایک جہت کی طرف رخ کر لینے کا نام ہے ' یکسو ہو جانے کا نام ہے ' وفاداری کا نام ہے ۔ ایمان بالباطل بھی ہو تو اس کی دنیا کے بازار میں ساکھ ہے ' منافقت کی کوئی ساکھ نہیں ۔ تقویٰ ' اپنے مانے ہوئے ضابطہ اخلاق کی پابندی اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے ۔ ظلم ' اسراف اور طغیان کا انجام تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ نہیں ۔

آج ۴۸ ویں یوم آزادی کے موقع پر ' اگر ہر قاری خود احتسابی کرے ' اس بات کا عزم کرے کہ قوم کے ایک ایک فرد میں بدلنے اور تبدیلی لانے کا احساس اور عزم پیدا کرنے کے لیے وہ روز کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا ' تو ہمیں یقین ہے کہ ہماری حالت میں تغیر نہ ناممکن ہے نہ دور کی بات ۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰىٓ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے " ۔ (الاعراف ۷ : ۹۶)

آزادی کا صحیح مفہوم

ہم مسلمان قوم ہیں۔ محض ایک قوم نہیں ہیں۔ ہمیں آزادی ایک مسلمان قوم کی حیثیت سے درکار ہے اور مسلمان قوم کی حیثیت سے آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہم جہاں انفرادی حیثیت میں خدا کی بندگی کے لیے آزاد ہوں وہاں بحیثیت قوم خدا کے احکام کی اطاعت کرنے کے لیے بھی آزاد ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم خدا کے دیے ہوئے قانون کو نافذ کرنے کے لیے آزاد ہوں اور اس تہذیب کی پیروی کرنے کے لیے آزاد ہوں جو اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی ہے۔ اگر اس لحاظ سے ہم آزاد نہ ہوں تو ہماری آزادی بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔

آخر عرب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن پیروؤں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ کیوں کی تھی؟..... عرب ہونے کی حیثیت سے ان کو مکہ میں پوری آزادی حاصل تھی۔ لیکن آزادی اگر حاصل نہیں تھی تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں تھی۔ اس وجہ سے انھوں نے وطن کو چھوڑا اور ایک دوسرے ملک میں چلے گئے جہاں ایک دوسری قوم آباد تھی اور ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ اسی طرح جب رسول اللہ ؐ نے مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کی' تو کیوں کی؟ آپ مکہ کے باشندے تھے۔ مکہ میں آپ ؐ کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو مکہ کے کسی شہری کو حاصل ہو سکتے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کو بھی وہ تمام حقوق حاصل تھے جو کسی قریشی کو قریشی ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے تھے لیکن جس چیز کی وجہ سے آپ ؐ نے اور آپ کے ساتھیوں نے گھر بار چھوڑا' جائیداد یں چھوڑ دیں اور تن کے کپڑوں میں نکل کھڑے ہوئے وہ چیز یہ تھی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو آزادی میسر نہیں تھی۔ اسی وجہ سے وطن چھوڑ دیا اور دوسرے شہر میں جا کر آباد ہوئے۔

قرآن مجید میں جہاد کے بعد دوسری اہم ترین چیز جس کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ہجرت ہے۔ اس ہجرت کی اسلام میں کیوں اتنی اہمیت ہے؟ یہ اہمیت اس لیے ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ اہم اگر کوئی شے ہے تو وہ اس کا اپنا دین ہے۔ اس کی قوم ہے' نہ اس کی روٹی ہے اور نہ اس کا پیٹ ہے' بلکہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ جن اصولوں پر وہ ایمان لایا ہے ان کے

مطابق وہ زندگی بسر کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکے۔ اگر وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو اس کے لیے آزادی کیا خود زندگی ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کی راہ میں قربان کر دینا زیادہ بہتر سمجھے گا بہ نسبت اس کے کہ ان اصولوں کو قربان کرے جن پر اس کے ایمان کا دارومدار ہے اور جن کے متعلق وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اصول حق ہیں اور خدا اور رسولؐ کے دیے ہوئے ہیں۔

اب آپ دیکھیے کہ ہمیں اپنے ملک پاکستان میں آزادی کس غرض کے لیے درکار ہے۔ کیا ہم ناچ اور گانے کی آزادی چاہتے ہیں؟ کیا ہم جوا کھیلنے کی آزادی چاہتے ہیں؟ کیا ہمیں عریانی، فحاشی اور بے شرمی و بے حیائی کی آزادی درکار ہے؟ ان چیزوں میں سے کون سی آزادی ہے جو ہمیں انگریزوں کے زمانے میں میسر نہ تھی؟ اور اگر ملک تقسیم نہ ہوتا اور ہندوؤں کے ہاتھ میں حکومت آتی تو ناچ گانے سے ہمیں منع کرنے والا کون تھا؟ جوئے شراب اور زناکاری سے منع کرنے والا کون تھا؟ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی آزادی ہمیں درکار نہ تھی۔ ہمیں اس بات کی آزادی بھی درکار نہ تھی کہ ہم غیر اسلامی قوانین بنائیں اور غیر اسلامی قوانین چلائیں۔ ہمیں اس بات کی بھی آزادی درکار نہ تھی کہ ہم اسی طرح کی الحاد و دہریت سکھانے والی تعلیم جاری رکھیں جو انگریز کے دور میں تھی۔

ہمیں جس غرض کے لیے آزادی درکار تھی وہ یہ تھی کہ انگریز نے ہمارے جن قوانین کو منسوخ کیا تھا ہم انھیں پھر سے جاری کرنے کے قابل ہوں۔ انگریز نے ہماری جس تہذیب کو مٹایا تھا ہم اس کو پھر تازہ کریں۔ انگریز نے ہمارے جس اخلاق کا ستیاناس کیا تھا ہم اسے پھر زندہ کریں۔ انگریز نے ہماری تعلیم کو جس طرح ختم کیا تھا، ہم اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیم اپنی آیندہ نسلوں کو دیں تاکہ وہ مسلمان بن کر اٹھ سکیں۔ یہ غرض تھی ہماری آزادی حاصل کرنے کی۔ واقعہ یہ ہے کہ تقسیم سے پہلے اگر کسی کو بتایا جاتا کہ پاکستان اس غرض کے لیے نہیں بنایا جا رہا ہے کہ اسلامی تہذیب کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور اسلامی قانون کو وہاں نافذ کیا جائے، بلکہ پاکستان صرف اس غرض کے لیے بنایا جا رہا ہے کہ کچھ لوگوں کو بڑے بڑے عہدے حاصل ہو سکیں اور کچھ لوگ لوٹ کھسوٹ کا کھیل کھیل سکیں، تو میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان اپنے خون کا قطرہ تو درکنار اپنے پسینے کا قطرہ بھی بہانے کے لیے تیار ہوتے اور فرض کیجیے کہ اگر بہانے کے لیے تیار بھی ہو جاتے تو وہ صرف وہ لوگ ہوتے جن کو یہ توقع تھی کہ ان کے بیٹے کل بڑے بڑے عہدے حاصل کر لیں گے۔ وہ مسلمان اس کے لیے کیوں تیار ہوتے جن کے لیے آج ہندستان کی سرزمین جہنم بنی ہوئی ہے۔ انھیں کیا پڑی تھی کہ ان اغراض کے لیے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے۔ کیا وجہ تھی کہ بمبئی اور مہاراشٹر کا مسلمان اٹھتا اور "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ لگاتا۔ اس نے اس امید پر اپنی جان کھپائی تھی اور اس امید پر اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا تھا، بلکہ

اپنی اپنی بستی اور اپنے اپنے شہر کو اپنے لیے جہنم بنا لیا تھا کہ کوئی خطہ زمین تو ایسا ہو جہاں خدا کا قانون نافذ ہو' جہاں اسلام سر اٹھا کر کھڑا ہو سکے' جہاں اسلامی تہذیب زندہ ہو' جہاں اسلامی تعلیم دی جائے۔ جہاں اسلامی اخلاق کی تربیت ملے اور جہاں قرآن و سنت کی حکمرانی ہو۔ اس امید پر ان لوگوں نے اپنی جانیں قربان کیں' اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا اور اپنے لیے تباہی مول لی۔ کیا اس کے سوا ان کی کوئی اور غرض بھی تھی؟ آج آپ ان کے حالات سنتے ہیں اور دن رات سنتے ہیں کہ ہندستان کے مسلمانوں پر کیا بیت رہی ہے' تو کیا آپ اس سے بے خبر ہیں کہ ان پر یہ حالت کیوں بیت رہی ہے؟ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہی آزادی ہمیں حاصل نہیں ہو رہی ہے جو مسلمان قوم کی حیثیت سے ہمیں مطلوب تھی' بلکہ جو کچھ انگریز کے زمانے میں ہو رہا تھا آج اس سے بیس گنا زیادہ ہو رہا ہے۔ انگریز کے زمانے میں قمار بازی' بدکاری' فحاشی' عریانی اور بے حیائی کا یہ حال نہ تھا جو آج ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ پھر کم از کم مسلمانوں کے پرسنل لا پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت تو کسی کو نہیں ہوئی تھی۔ انگریز نے تمام دوسرے اسلامی قوانین منسوخ کر دیے' لیکن جہاں تک مسلمانوں کے پرسنل لا کا تعلق ہے اس پر ہاتھ ڈالنے کی وہ جرات کبھی نہ کر سکا اور ہندستان کی ہندو حکومت اب تک یہ ہمت نہیں کر سکی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کام بھی کر کے دکھا دیا گیا اور اسلامی قانون میں وہ ترمیمات کر دی گئیں جن کو تمام علما بالاتفاق اسلام کے خلاف قرار دے چکے ہیں۔ آج ہم اسلام کی دی ہوئی خدا پرستانہ تہذیب کو تازہ کرنے کے بجائے روز بروز مختلف مادہ پرستانہ تہذیبوں کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ ہماری پیشانیوں پر لکھا ہوا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد بھی انگریز بنے رہنے کا شوق ہے۔ اس پر انگریز مسلط نہیں رہا مگر انگریزیت اب بھی مسلط ہے اور انگریزیت سے اگر کوئی بچ گیا تو وہ امریکی بن رہا ہے' یا چینی اور روسی بننا چاہتا ہے' مسلمان بن کر نہیں رہنا چاہتا۔

ہم بولتے ہیں تو اسی زبان میں بولتے ہیں جو انگریز کے دور میں ہم کو دی گئی تھی۔ ہم پہنتے ہیں تو وہ لباس پہنتے ہیں جو انگریز ہمیں پہننا سکھا گیا ہے۔ ہم تعلیم پا رہے ہیں تو وہی تعلیم پا رہے ہیں جو انگریز نے یہاں نافذ کر دی تھی۔ ہمارے معاملات چلتے ہیں تو انھی اصولوں کے مطابق جو انگریز ہمیں دے گیا تھا۔ ہم اس کی ایک ایک چیز کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔

آپ میں سے ہر شخص اس بات پر غور کرے کہ فی الواقع ہم نے اب تک کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے اور جو کچھ پایا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے' لیکن جو کچھ نہیں پایا ہے اور جسے آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں' اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو اندیشہ ہے کہ غیروں کی غلامی

سے جو نجات آپ کو ملی ہے' اس سے بھی آپ کہیں ایک روز محروم نہ ہو جائیں۔ کیونکہ جو آزادی مسلمان قوم میں اسلامی اقدار' اسلامی تہذیب اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بنے اس آزادی کی حفاظت مسلمان کبھی نہیں کر سکتا۔ دنیا کی کوئی دوسری قوم کسی دوسری چیز کے بل بوتے پر اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے لڑ سکتی ہے' لیکن مسلمان اگر جان دے سکتا ہے تو صرف ایمان کے لیے۔ وہ جس ایمان کو عزیز رکھتا ہے اس کے ضائع ہونے کا خطرہ اسے سربکف بنا سکتا ہے۔ لیکن اگر سرے سے اس کے ایمان کی ہی جان نکال دی جائے تو اس کے بعد وہ محرک کیا رہ جاتا ہے جس کے لیے وہ جان دے گا۔ خود ۱۹۶۵ کی جنگ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پاکستان کو جس چیز نے بچایا وہ اسلامی جذبہ تھا۔ کوئی قومی یا وطنی جذبہ نہ تھا۔ اس جنگ میں لڑنے والا اس خیال سے لڑا کہ میں خدا کی راہ میں لڑنے جا رہا ہوں۔ جس نے جان دی ہے یہ سمجھتے ہوئے دی ہے کہ میں شہید ہو رہا ہوں۔ اگر اس کو یہ یقین نہ ہوتا کہ میں شہید ہو رہا ہوں اور میری اس موت کے بعد مجھے جنت نصیب ہوگی تو سرفروشی کی وہ تاریخ مرتب نہ ہو سکتی تھی جو اس جنگ میں مرتب ہوئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر وہی اصل چیز جس کے بل پر مسلمان قربانی کر سکتا ہے' ختم کر دی جائے تو آپ کہاں سے وہ جذبہ قربانی لے کر آئیں گے جس سے اس سرزمین کی حفاظت ہو سکے۔ اسی لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر یہاں صحیح اسلامی آزادی قائم نہ ہو تو ہم نے غیروں سے جو آزادی حاصل کی ہے اس کی بھی حفاظت نہ کر سکیں گے۔

(۲۱ واں یوم آزادی ' ۱۴ اگست ۱۹۶۷' باغ بیرون موچی دروازہ' لاہور)

اِستغفار و توبہ

سید حامد علی

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

ان العبد اذا اخطأ خطیئةً نکتت فی قلبه نکتة سوداء فاذا هو نزع واستغفر و تاب سقل قلبه وان عاد زید فیها حتی تعلو قلبه وهو الران الذی ذکر اللہ کلا بل ران علی قلوبهم ما کانوا یکسبون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے۔ پھر جب وہ گناہ سے باز آجاتا ہے اور (اللہ سے) مغفرت چاہتا اور توبہ کرتا ہے تو اس کا دل پاک صاف ہو جاتا ہے' لیکن اگر وہ پھر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ سیاہ نشان اور بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ (بڑھتے بڑھتے) اس کے دل پر چھا جاتا ہے اور یہی وہ "ران" (دل کا زنگ) ہے جس کا اللہ نے اس طرح ذکر فرمایا ہے: "بالکل غلط! اصل حقیقت یہ ہے کہ جو غلط کاریاں وہ کرتے رہے ہیں وہ ان کے دلوں پر زنگ بن کر چھا گئی ہیں" (ترمذی، نسائی، ابن ماجه، احمد، حاکم، ابن حبان، ترغیب و ترہیب)

"جب بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے"

بندے سے مراد بندہ مومن ہے جو اللہ کی "بندگی" کا عہد کر چکا ہے' حدیث کے سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے نیز مسند احمد کی روایت میں " ان العبد اذا اخطاء خطیئته " کے بجائے " ان المومن اذا اذنب ذنباً بیشک مومن جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے" کے الفاظ صراحتاً موجود ہیں۔

جب بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے۔ سیاہ نشان سے کوئی مادی نشان یا داغ دھبہ مراد نہیں' بلکہ وہ باطنی اثر ہے جو نافرمانی کی وجہ سے انسان کے دل پر مرتب ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان کے اندر اللہ کی اطاعت کا مادہ کم اور اس سے دوری بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے ہر صاحب احساس' جو کسی بھی گناہ میں مبتلا ہو جائے بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ اس ارشاد نبوی ؐ سے

معلوم ہوا کہ اللہ کی کوئی ایک نافرمانی محض اللہ کی ناخوشی اور عذاب آخرت ہی کی موجب نہیں ہے بلکہ اس سے انسان کا دل بری طرح متاثر ہوتا ہے وہ دل جو انسان کے بدن میں تمام افکار و اعمال کا مرکز ہے اور جس کی درستی اور جس کا خشوع سب سے زیادہ مطلوب ہے اور انسان ایک دوسری نافرمانی کی طرف بڑھنے کے خطرے میں گھر جاتا ہے۔ یہ ہر نافرمانی کا خاصہ ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی' فرق صرف تناسب کا ہے' بڑے گناہ سے قلب پر زیادہ برے اور مہلک اثرات مرتب ہوتے ہیں اور چھوٹے گناہ سے نسبتاً کم مہلک اثرات۔

"پھر جب وہ گناہ سے باز آجاتا ہے اور (اللہ سے) مغفرت چاہتا اور توبہ کرتا ہے تو اس کا دل پاک صاف ہو جاتا ہے"۔

ان الفاظ میں توبہ کے تینوں اجزا اور مراحل کا ذکر موجود ہے۔ متن میں علی الترتیب تین الفاظ ہیں۔ نزع ، استغفر اور تاب۔

"نزع" کے معنی ہیں "کسی کام سے باز آگیا' رک گیا" یہ توبہ کی پہلی اور بنیادی شرط ہے اگر انسان زبان سے "استغفر اللہ" کہتا رہے مگر گناہ سے نہ رکے تو یہ ہرگز توبہ نہ ہوگی بلکہ ایک شارح حدیث کے بقول اللہ کے ساتھ مذاق ہو گا۔

دوسرا لفظ "استغفر" ہے جس کے معنی ہیں "مغفرت چاہی" یعنی صرف گناہ سے رک جانا کافی نہیں ہے بلکہ اللہ کی نافرمانی کو نافرمانی سمجھ کر اس پر نادم ہو' اس کے ہولناک عواقب سے لرزاں و ترساں ہو اور خلوص دل اور خشوع قلب کے ساتھ اللہ سے اس بات کی التجا کرے کہ وہ اس گناہ پر عذاب نہ دے' بلکہ اپنے رحم و کرم سے معاف کر دے۔ یہ کیفیت جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر توبہ صحیح معنی میں توبہ ہوگی اور اسی قدر انسان آیندہ اللہ کی نافرمانی سے بچ سکے گا۔ تیسرا لفظ "تاب" ہے اس کے معنی ہیں "پلٹا' رجوع کیا' متوجہ ہوا" یعنی اتنا کافی نہیں ہے کہ انسان گناہ سے باز آجائے اور مغفرت کا طالب ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اللہ سے اپنے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے استوار کرے' اپنے مالک و آقا سے بندگی کے عہد کی تجدید کرے' اپنے رب کی اطاعت کی راہ پر گامزن ہونے اور اس کی وفاداری کے تقاضے پورے کرنے میں سرگرمی کے ساتھ منہمک ہو۔ توبہ کی حقیقت یہی ہے اور کسی گناہ کے بعد جس قدر یہ کیفیت انسان کے اندر ابھرے گی اسی قدر اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ انسان کی غلطی معاف ہو جائے' اس کا دل پاک و صاف ہو جائے اور وہ پہلے سے زیادہ اللہ سے قریب ہو سکے۔

یعنی نافرمانی سے انسان کے دل میں جو گندگی پیدا ہو گئی تھی استغفار سے وہ گندگی زائل ہو جاتی ہے اور گناہ کرنے کی وجہ سے قلب کے اندر خشوع اور جذبہ عبودیت میں جو کمی آگئی تھی وہ توبہ سے دور ہو جاتی ہے اور انسان کا دل اللہ کی بندگی کے صالح جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ توبہ انسان کی فلاح' اس کی خامیوں کے ازالے اور اس کے ارتقا کے لیے کس قدر ضروری ہے!

لیکن اگر وہ پھر گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ سیاہ نشان اور بڑھ جاتا ہے۔

یعنی اللہ کی نافرمانی کا اعادہ انسان کے دل کی قساوت اور اس کی تاریکی کو اور بڑھا دیتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اللہ کی بندگی کی راہ سے مزید دور ہو جاتا ہے اور اس کے لیے اطاعت کی راہ پر گامزن ہونا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

یہی وہ ران (دل کا زنگ) ہے جس کا ذکر اللہ نے اس طرح فرمایا ہے:

بالکل غلط! اصل حقیقت یہ ہے کہ جو غلط کاریاں وہ کرتے رہے ہیں وہ ان کے دلوں پر زنگ بن کر چھا گئی ہیں۔

یہ سورۂ مطففین کی ایک آیت ہے جس کے اندر کفار کی ایک بنیادی خامی بیان ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ ہدایت الٰہی کو قبول نہیں کر رہے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں اس آیت کا ذکر گناہ گار مسلمانوں کے سلسلے میں فرمایا ہے جس سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ جس طرح حق کو حق جانتے ہوئے اس سے مسلسل اعراض کرنے کی وجہ سے اہل کفر کے لیے اب ہدایت الٰہی کا قبول کرنا سخت مشکل ہو رہا ہے اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ کے دین کو قبول کر لے مگر عملاً اس کی مسلسل خلاف ورزی کرتا چلا جائے تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ مسلسل نافرمانی کے نتیجے میں ایک وقت ایسا آجائے کہ اس کے لیے اللہ کے دین پر عمل کرنا اور اس سے اپنے تعلق کو برقرار رکھنا سخت مشکل ہو جائے جس شخص کو بھی اپنا دین و ایمان عزیز ہو اور جسے آخرت کا ذرا سا بھی اندیشہ ہو وہ اس خطرے کو مول لینے کی جرات کر سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کسی مومن کو نہ اللہ کی نافرمانی پر جری ہونا چاہیے اور نہ توبہ کی طرف سے غافل۔

بالکل غلط یعنی قرآن پاک کے سلسلے میں جو الٹے سیدھے اعتراضات کرتے رہتے ہیں ان میں کوئی جان نہیں ہے' اصل بات یہ ہے کہ ان کی اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے ان کا نور بصیرت زائل ہو چکا ہے اور وہ حق کو مسلسل ٹھکرانے کی وجہ سے قبولیت حق کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔

ماحصل

اللہ کی نافرمانی انسان کی حیات قلبی کے لیے سم قاتل ہے' اور توبہ تریاق۔ انسان اگر چاہتا ہے کہ اس کا نور ہدایت زائل نہ ہو تو وہ اللہ کی نافرمانی کے معاملے میں بے باک نہ ہو' نہ اس کی حکم عدولی پر اصرار کرے۔ اگر کبھی کسی وقتی تحریک کے نتیجے میں اس سے کوئی گناہ ہو جائے تو جلد از جلد توبہ کے پانی سے اپنے دل کو صاف کرنے اور نافرمانی کے زہریلے اثرات کو زائل کر دینے کی طرف متوجہ ہو۔ گناہ کو حقیر سمجھنا اور توبہ سے غفلت برتنا اپنی ہلاکت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہر ابن آدم خطا کار ہے اور خطا کاروں میں بہتر وہ لوگ ہیں جو توبہ شعار ہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

ہر ابن آدم خطا کار ہے

یعنی انسان میں فطرتاً ایسی کمزوریاں موجود ہیں کہ اس سے اللہ کی نافرمانی کا صدور ہو سکتا ہے اور اگر اللہ کی خاص نگرانی شامل حال نہ ہو تو انسان کے دامن کا اس گندگی سے بالکل پاک رہنا سخت مشکل ہے۔ اس ارشاد سے دو باتوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے۔ ایک تو یہ کہ کوئی انسان اپنی حالت پر مطمئن اور اپنے احتساب سے غافل نہ ہو۔ اسے یہ حقیقت بخوبی یاد رہے کہ اس سے ہر آن غلطی ہو سکتی ہے۔ اور اگر وہ چوکنا اور ہوشیار نہ رہے تو نفس کی کمزوری اور شیطان کی وسوسہ اندازی سے اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہو جانے کا ہر دم اندیشہ ہے۔ دوسری بات جو ذہن نشین کرانی ہے وہ یہ ہے کہ انسان سے اگر غلطی ہو جائے تو وہ اپنے آپ سے مایوس نہ ہو جائے اور اپنی اصلاح سے دل برداشتہ ہو کر جی چھوڑ نہ بیٹھے۔ اس ارشاد میں گناہ گاروں کے لیے تسلی کا پیغام ہے' ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم سے اللہ کی نافرمانی ہو گئی تو تمھیں اپنے سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ اس لیے اپنے آپ سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں' غلطی کا تدارک کرو اور اپنی شخصیت اور اپنے مستقبل سے پوری طرح پرامید رہو۔

اور خطا کاروں میں بہتر وہ لوگ ہیں جو توبہ شعار ہیں۔

یعنی انسان کا معیار مطلوب یہ نہیں ہے کہ اس سے گناہ سرزد ہی نہ ہو۔ انسان سے تو کوئی نہ کوئی لغزش ہو ہی جاتی ہے۔ بہترین اور معیاری انسان وہ ہے کہ جب بھی اس سے غلطی ہو جائے وہ فوراً اللہ کی طرف رجوع کرے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے۔ ہر لغزش اس کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہو' وہ اپنی کمزوریوں پر مطلع ہو کر ان کے ازالے کی طرف شدت سے متوجہ ہو' جب بھی اس کے ہاتھ سے اللہ کی رسی چھوٹ جائے' وہ لپک کر پہلے سے زیادہ مضبوطی کے ساتھ اسے تھام لے' جب بھی اللہ کی ناخوشی کا کوئی کام اس سے ہو جائے' وہ رو رو کر اور گڑگڑا کر اپنے آقا کو خوش کرنے اور پہلے سے زیادہ اس کی خوشنودی کے کاموں میں لگ جائے۔ بالفاظ دیگر توبہ کرنا اس کی مستقل صفت ہو' ایسے ہی انسان اللہ کو محبوب ہیں اور ایسے ہی لوگ نوع انسانی کا بہترین عنصر ہیں۔

ماحصل

بہترین انسان وہ ہیں جو اپنی کمزوریوں کی طرف سے بے فکر ہونے کے بجائے ان سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ پاک کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں اور جب بھی ان سے کوئی چھوٹی یا بڑی غلطی ہو جاتی ہے' وہ توبہ کے ذریعے اس کا تدارک کر کے اپنے مالک سے اپنے تعلق کو اور زیادہ استوار کر لیتے ہیں۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست

سید مناظر احسن گیلانی

شرعی مطالبات کی خود ساختہ توجیہوں اور تاویلوں کی جسارتوں سے زیادہ مناسب 'کیا یہ نہیں کہ خود شریعت اور شریعت کی کتاب ہی میں یہ تلاش کیا جائے کہ اپنے ان مطالبات سے کن مقاصد کی تکمیل اس کے پیش نظر ہے۔ ماننے والے یہ جانتے ہیں کہ قرآن میں براہ راست خطاب الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے ہر فقرے اور ہر آیت کی بنیاد انسانی عقل کی ناقص معلومات 'ادھورے تجربات ' مشتبہ مشاہدات پر نہیں 'بلکہ عالم الغیب والشہادۃ کے اس محیط علم پر قائم ہے جس کے احاطہ سے نہ کوئی چیز خارج ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اعتماد و یقین کے لیے اس سے زیادہ محکم اور زیادہ استوار اساس کا کیا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے!

یہ دوسری بات ہے کہ اس دعوے کو --- یہ کتاب خدا اور خالق کائنات کی کتاب ہے --- مشتبہ ٹھہراتے ہوئے ' دعوے کو پیش کرنے والے ہی کے متعلق العیاذ باللہ افترا اور جھوٹ کے وسوسے کی نیش زنی سے کسی بد بخت کو نجات نہ ملی ہو۔ ان مسکینوں ' عقل کے مسکینوں ' کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ پاتے ہیں ' اور یہی ان کو پانا بھی چاہیے کہ خدا کے نام سے قرآن کے پیش کرنے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کی عظمتوں سے ان کے قلوب لبریز ہیں۔ آپ کی بے داغ صداقت اور سچائی کے وزن سے ان کا دل ان کا دماغ دبا چلا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی رمق بھی جن کے اخلاقی حاسہ میں باقی رہ گئی ہو ' نہ ماننے پر مصر ہونے کے باوجود انھوں نے اسی کے اقرار پر اپنے آپ کو بے بس پایا کہ سچے ہونے کے لیے کسی انسان کو جو کچھ بھی ہونا چاہیے وہی سب کچھ محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

بہر حال کچھ بھی ہو ' دوسروں کے متعلق تو میں نہیں کہتا ' اپنا حال یہی ہے کہ قرآنی خبریں --- مثلاً یہی کہ نیکو کاروں اور بدکرداروں کا انجام ایک نہیں ہو سکتا ' مٹی میں مل کر ظالم اور مظلوم دونوں

کا قصہ ختم ہو کر برابر نہیں ہو جاتا بلکہ الدین یعنی بدلے کی اقتداری قوت کے ساتھ مالک بن کر' ایک دن سب کے سامنے ان کا پیدا کرنے والا آئے گا اور کیے کے نتیجوں تک کرنے والوں کو پہنچا دے گا ان سے نظم عالم کے لاحاصل ہونے کے بجائے' اس کی معنویت و افادیت کی آگاہی قرآن سے حاصل ہوتی ہے۔ جس آنے والی گھڑی کی تعبیر اسی کتاب میں الساعة اور القیامة سے کی گئی ہے -- کہ نتائج کو اگلنے کے لیے دنیا اس وقت کھڑی ہوگی اس گھڑی کو اس وقت تک تو میں اپنے سامنے پاتا ہوں جب تک قرآنی آیتوں اور اس کی دی ہوئی خبروں کی عینک میرے اعتماد و یقین کی آنکھوں پر چڑھی رہتی ہے۔ گوشت' پٹھوں اور رگوں کے مجموعے سے بنی ہوئی' اور پیشانی کی ہڈیوں میں جڑی ہوئی' آنکھوں کا مشاہدہ' یقین کی اس کیفیت کو میرے اندر نہیں پیدا کر سکتا تھا' جس کی لازوال قوت کو میں اپنے دل کے اس یقین اور سکون و اطمینان میں پاتا ہوں' جو محمد رسول اللہ ؐ کو سچا مان لینے کے بعد قیامت کے متعلق قرآنی خبریں مجھ میں پیدا کرتی ہیں۔

شبہ کی آلائشوں سے میرا یہ قرآنی یقین پاک اور قطعاً پاک ہے۔ کیونکہ اس علم میں واسطہ' نقائص اور کوتاہیوں سے بھرا ہوا' میرے جسم کا آلہ (آنکھ) نہیں ہے' بلکہ علم و دانش کا وہ لازوال خزانہ ہے جس پر چوک اور غلطی' غلط فہمی کے اندیشوں اور وسوسوں کی ساری راہیں بند ہیں۔ ادراک و علم کا یہی ایک واحد تنہا ذریعہ ہے' جس پر نہ شکوک کے بادل ہی چھا سکتے ہیں اور نہ بے اعتمادی کی ہوا ہی اس کو چھو سکتی ہے۔

علم اور صرف علم' یقین اور فقط یقین!

دھلا دھلایا' صاف ستھرا' شفاف' و تاباں و درخشاں علم!!

لیکن عالم کے اس موجودہ نظام کے اسی فائنل رزلٹ کی قرآنی اطلاع کے پیچھے جوں ہی کہ عقلی کندھوں کے لگانے والوں کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں' اور دیکھے ہوئے مشاہدات سے بھی زیادہ ناقابل زوال یقین پر جس علم کی بنیاد قائم ہے' جب اس کی پشتیبانی کا ارادہ استدلال کے پایے چوبیں سے کیا جاتا ہے' تو میں سچ کہتا ہوں' مجھ پر تو خفقان کا دورہ پڑنے لگتا ہے۔ جو چیز روشنی میں تھی کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ تاریکی کی گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہے' اور جو بات سامنے تھی' نظروں سے گویا اوجھل ہو رہی ہے۔ بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ نعرہ خلیلی لا احب الآفلین ' میں نہیں چاہتا ڈھل جانے والے کو' کے ساتھ میں بھی چیخ اٹھوں۔

کچھ ٹھکانہ ہے ان بے تمیزیوں کا؟ خبر تو دی ہی جاتی ہے ایسی چیزوں کی جو سامنے نہ ہوں۔ دن کی روشنی میں جو یہ اطلاع دے کہ آفتاب چمک رہا ہے' یا جمعے کے بعد ہفتے کا دن آئے گا' گرمی کے بعد

برسات اور برسات کے بعد سرما کا موسم نمودار ہو گا۔۔۔۔۔ بھلا سامنے کے ان واقعات ' روز مرہ پیش آنے والے ان مشاہدات کی بھی کوئی خبر دیا کرتا ہے۔ لوگ سوچتے نہیں ' ورنہ بادنیٰ تامل ان پر واضح ہو سکتا ہے کہ مذہب و ادیان میں یہ کبھی نہیں منوایا جاتا کہ زمین دکھائی دے رہی ہے 'تارے چمک رہے ہیں ' درخت جھوم رہے ہیں یا پانی بہہ رہا ہے 'ان باتوں پر ایمان لایا جائے 'ان کو مانا جائے۔

نبوتوں اور رسالتوں کی آگاہیوں اور دعوت کا تعلق 'کون نہیں جانتا' ان ہی حقیقتوں سے ہوتا ہے جن کو علم و ادراک کے عام اور معمولی ذرائع سے نہ ہم جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں۔

یہی قیام قیامت کا قصہ ہے۔ زندگی سے جو ایک وقت محروم تھے ' ان کو آج زندگی پانے کے بعد اچنبھا ہوتا ہے کہ زندگی سے محروم ہو جانے 'یعنی مرنے کے بعد ' پھر زندہ ہونے کا موقع ان کو کیسے ملے گا! آپ دیکھ رہے ہیں ' خواہ مخواہ کے انقباض اور بے معنی گرانی کے سوا اس قسم کے بے بنیاد وسوسوں کی تہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔

اوروں کو جانے دیجیے جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور یہ ہی مان کر اس کی تلاوت بھی کرتے ہیں ان سے میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ اس کتاب میں ایسی آیتیں نہیں پاتے۔ جس کا جی چاہے اس کتاب کو اٹھالے ' اس کو اسی نوعیت کی آیتیں ملتی چلی جائیں گی جن میں قیام قیامت کے تعین کی بنیاد حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے وعدے ' اپنے اعلان ' اپنے بیان ' اور اپنی خبر 'اپنی اطلاع ہی کو ٹھہرایا ہے۔

واقعہ یہی ہے کہ بجائے مخلوقات کے ' خود عالم کے پیدا کرنے والے خالق کی خبر سے زیادہ یقینی آگاہی کا ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لے دے کر اس راہ میں بحث و نظر کی ضرورت صرف اتنی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (العیاذ باللہ) غلط بیانی سے تو کام نہیں لیا؟ جوں ہی کہ یہ مسئلہ طے ہوا ' اچانک ہم مخلوقات کے سامنے سے ہٹ کر براہ راست خالق کائنات کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا پاتے ہیں۔

اب میرے کان خدا کی آواز سن رہے ہیں ' اور کان کے سنے ہوئے ان الفاظ ' یا آنکھوں سے دیکھے ہوئے قرآنی حروف سے ' میرے دل کو دماغ کو براہ راست خالق کائنات سے آگاہیاں حاصل ہو رہی ہیں ' میری دانش ' میرا علم سبحانہ وتعالیٰ کے علم محیط کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے۔

مختصر سی بات بہت طویل ہو گئی۔ ذکر تھا قرآن کے مطالبے کا۔ مثلاً ' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خود قرآن ہی میں روزے کے متعلق خالق کائنات نے جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے ان سے لاپروائی اختیار کر کے ' خدا کے اس مطالبے کے اندر بندوں کے پیدا کردہ من مانے مطالب بھرنے ' یا اپنی خود تراشیدہ

حکمتوں اور مصلحتوں کو اس الٰہی مطالبے سے برآمد کرنے کا عام رواج جو اس زمانے میں مقبول ہو رہا ہے' اور تھوپنے والے اللہ کی باتوں پر اپنی عقل کے تخیلات کو جو تھوپ رہے ہیں' اس سے کیا حاصل ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک تو بجائے بڑھنے کے غیر شعوری طور پر اس طریقے سے قرآن کے مطالبے کی قوت شاید گھٹ رہی ہے۔

آخر روزے کی یہ فیلا سفیاں -- مثلاً یہ کہ روزہ طبی منافع کا ضامن ہے' یا بھوکوں کی بھوک کی تکلیف کا احساس روزے کے ذریعے سے شکم سیروں اور پیٹ بھروں کے اندر پیدا کرانا مقصود ہے ---لٹک لٹک کر پنڈالوں میں حکمت کے یہ دریا جو بہائے جاتے ہیں' اور اب تو منبروں سے بھی اسی کی آواز بازگشت ٹکرانے لگی ہے' کیا واقعی روزے کی یہی صحیح قیمت ہے جو اسلام کے ان گوہرناشناس صرافوں کی طرف سے لگائی جا رہی ہے۔ وہ کیا جواب دے سکتے ہیں اگر پوچھا جائے کہ جسمانی صحت کی شکایت جن لوگوں کو نہیں ہے' ان کو آپ کے اس طبی منافع کی ضمانت سے مستفید ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یا جن امیروں کے باورچی خانوں سے غریبوں اور بھوکوں کو کھانا تقسیم ہی ہوتا رہتا ہے' خواہ مخواہ ان بے چاروں کو بھوک سے مرنے والوں کے دکھ کا مزہ کیوں چکھایا جائے؟

سچ تو یہ ہے کہ جس کی سرشت میں بغاوت و طغیان کا ایسا طوفان پوشیدہ ہو کہ اپنے پیدا کرنے والے کے حکم کو لاپروائی کے ساتھ ٹال دینے کی جرات کر سکتا ہو' اس سرکش کو اسی جیسے مخلوق انسان کی اسرار آفرینیوں سے روزہ رکھنے پر' سوچیے تو سہی' کہاں تک راضی کرنے میں آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

کچھ بھی ہو' اپنا ذاتی احساس تو یہی ہے کہ مصالح اور فلسفے کے دور دراز قصوں سے کہیں زیادہ بہتر تھا' اور ہے' آیندہ بھی رہے گا' کہ بندوں کو ان کے پیدا کرنے والے خالق کا حکم سنا دیا جائے' حکم دینے والے نے حکم کے جو کچھ اسباب و وجوہ اور مصالح و فوائد بتائے ہوں ان کو بھی سمجھا دیا جائے۔ آگے چھوڑ دیا جائے بندے کو اور اس کے پیدا کرنے والے کو۔ اطاعت و بغاوت کے پارے کے اتار اور چڑھاؤ کا دارومدار ---چاہے کوئی مانے یا نہ مانے' مگر جو بھی سوچے گا یہی پائے گا--- اعتماد اور بھروسے کی اس کیفیت پر ہے جو بندوں کو خالق کی مرضی سے آگاہ کرنے والے درمیانی واسطے (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق دلوں میں پائی جاتی ہے۔

بمصطفیٰ برسان خویش را کہ دیں ہمہ اوست

"ہمہ اوست" کے اس اقبالی نظریے ہی میں سچ پوچھیے تو دین کا سارا راز پوشیدہ ہے۔ جس نے یہ سمجھ لیا سب کچھ سمجھ لیا' اور سب کچھ سمجھ لینے کے بعد بھی اس حقیقت سے جس کا دل بیگانہ رہا'

یقین مانیے کہ زبان سے لاکھ دین اور مذہب کے نعرے لگاتا ہو کیا دل نے بھی اس کے کچھ پایا ہے؟ اس کا پتہ دل ہی کے ٹٹولنے سے خود اس کو چل سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہی دین کا فلسفہ بھی ہے اور یہی اس کی سائنس بھی۔ یہی علم کلام ہے اور یہی تصوف اور یہی وہ سب کچھ جس کا نام دین اور مذہب کے دائرے میں لیا جاتا ہے یا لیا جاسکتا ہے۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے۔

خراباتیاں مے پرستی کنند   محمد بگویند و مستی کنند

(اہل خرابات مے پرستی کر رہے ہیں' محمد کا نام لیتے ہیں اور مستی کرتے ہیں۔)

(اخذ و تلخیص : خرم مراد)

۱۹۷۲

حیات طیبہ کے چند جذباتی لمحات

مکی دور

عبدالحمید صدیقی

شعور کی طرح جذبہ انسانی زندگی کے لیے خداوند تعالیٰ کی ایک مستقل اور لازوال نعمت ہے۔ جب تک انسان سانس لیتا ہے جذبہ بھی اس کے ساتھ موجود رہتا ہے۔ البتہ اس کی کیفیات 'حالات' ماحول اور مزاج کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ ہلکی سی لے کی طرح انسان کے اندر ارتعاش پیدا کرتا ہے کبھی یہ شدت اختیار کر کے اس کی زندگی میں زلزلہ اور طوفان اٹھاتا ہے کبھی روحانی کیف و مستی کے زیر اثر آکر قلندرانہ وجد و حال کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے کبھی یہ ایک خاموش اور پرسکون روش اختیار کر لیتا ہے کہ اس کی حرکت و حرارت کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن یہ کسی نہ کسی صورت میں بہر طور موجود ضرور رہتا ہے۔

ایک عام انسان اور نبی کے ارفع مقام کے درمیان جو امتیاز ہے' اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نبی چونکہ نوع بشری کی رشد و ہدایت کے لیے مامور ہوتا ہے اس لیے اس کا تعلق نوع انسان ہی سے ہوتا ہے اور وہ انسانی داعیات کے ساتھ ہی انسانی معاشرے کے اندر اپنے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ غم کے لمحات میں وہ دل گرفتہ اور بے چین ہوتا ہے' خوشی کے مواقع پر اس کا دل راحت اور آسودگی محسوس کرتا ہے' اعدائے دین کی چیرہ دستیاں اور دل آزاریاں اور راہ حق سے انحراف کے لیے ان کی ہٹ دھرمیاں اسے رنجیدہ اور مغموم کرتی ہیں۔ رفقا کی کوتاہیوں پر وہ ناگواری کا اظہار کرتا ہے اور ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر مسرور ہوتا ہے۔ الغرض بھوک' پیاس' علالت' عزیزوں اور دوستوں کی وفات' زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز' پریشانیاں اور الجھنیں اسے دوسرے انسانوں کی طرح ہی متاثر کرتے ہیں' تو ان اثرات کے ہجوم میں بھی وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو اس کے عظیم مرتبے سے فروتر ہو۔ وہ ان نوعبہ شکن حالات میں بھی سیرت و کردار کا اعلیٰ نمونہ

پیش کرتا ہے اور اس مثالی طرز عمل کا اظہار کرتا ہے جس کا حکم اسے مالک کائنات نے دیا ہے۔ چنانچہ وہ خوشی کے موقع پر خوش تو ہوتا ہے مگر لہو ولعب میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے خالق کے سامنے سجدہ شکر بجالاتا ہے جس نے اس کے لیے مسرت و شادمانی کا سامان پیدا کیا۔ اسی طرح وہ دکھ اور مصائب میں رنجیدہ خاطر تو ہوتا ہے مگر کسی قسم کا احتجاج نہیں کرتا بلکہ اس قادر مطلق کی طرف رجوع کرتا ہے جو ناخوشگوار حالات پیدا کرنے اور تنگی کو فراخی میں بدلنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

جس طرح عقل کو زندگی سے خارج کر کے محض جذبات کے سہارے زندہ رہنا فطرت کے خلاف جنگ ہے' اسی طرح حیات انسانی کو جذبات سے محروم کر کے یا انھیں پوری طرح دبا کر محض شعور اور آگہی کے بل بوتے پر زندگی بسر کرنا انسانی جان کے ساتھ انتہائی ناانصافی ہے۔ شعور و جذبہ دونوں کا زندگی میں اپنا اپنا مقام اور کردار ہے اور دونوں کے حسین امتزاج ہی سے زندگی میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ اس مضمون میں حضور سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ اور دلاویز زندگی کے جذباتی لمحات میں آپ ؐ کے خداپرستانہ طرز عمل کی چند جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ محترمہ اور جد امجد کی وفات پر جس طرح دل گیر ہو کر آنسو بہائے اس سے آپ ؐ کے جذبات کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پھر غار حرا میں جب جبرائیل امین وحی لے کر پہلی بار حضور ؐ کے سامنے ایک نورانی پیکر میں نمودار ہوئے تو آپ ؐ قدرتی طور پر خوف زدہ ہوئے کیونکہ آپ ؐ ان کی ذات سے پہلے آشنا نہ تھے۔ چنانچہ آپ ؐ گھبراہٹ کے عالم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس گھر تشریف لائے اور انھیں فرمایا: "زملونی" (مجھے کچھ اڑھاؤ)۔ جب کچھ دیر کے بعد گھبراہٹ دور ہوئی تو آپ ؐ نے اپنی رفیقہ حیات ؓ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ یہ سن کر ان سعادت مند خاتون نے جو آپ ؐ کے اوصاف حمیدہ سے پوری طرح واقف اور آپ ؐ کی عظمت کی سب سے زیادہ معترف تھیں' یہ کہہ کر آپ ؐ کو تسلی دی: آپ ؐ ہرگز خوف زدہ نہ ہوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ خدا کی قسم مالک الملک آپ ؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ ؐ صلہ رحمی کرنے والے' راست گو' لوگوں کے بار اٹھانے والے' ناداروں اور مسکینوں کی خبرگیری کرنے والے ہیں۔ آپ ؐ امین ہیں اور مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہیں اور ناساعد حالات میں لوگوں کی اعانت اور دستگیری کرتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

جب آپ ؐ نے حق کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا تو ہر طرف سے آپ ؐ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ لیکن آپ ؐ خداوند تعالیٰ کی تائید کے سہارے پورے صبر و ثبات کے ساتھ یہ فرض سرانجام دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اس اثنا میں ایک نازک مرحلہ ایسا بھی آیا جس میں حضور ؐ کے

مربی اور کفیل جناب ابو طالب بھی قریش کے دباؤ کے تحت اس بات پر مجبور ہو گئے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دین کے کام سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ حضور ؐ کی زندگی کے جذباتی لمحات میں یہ ایک نہایت ہی نازک لمحہ تھا۔ ایک طرف قریش کی مخالفت اور مخاصمت تھی اور دوسری طرف وسائل کی کمی اور پیارے چچا' جو دنیاوی سہاروں میں حضور ؐ کے لیے واحد طاقتور سہارا تھے' کی مجبوریاں تھیں۔ ان صبر آزما لمحات میں یہ عین ممکن تھا کہ اگر آپ ؐ اپنے چچا کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیتے تو ان کی حفاظت اور کفالت سے محروم ہو جاتے اور پھر آپ ؐ کو قریش کی دراز دستیوں سے بچانے والی کوئی موثر شخصیت اس معاشرے میں باقی نہ رہتی۔ ابن ہشام میں اس واقعہ کی پوری تفصیل موجود ہے۔ جب قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغی سرگرمیوں پر' اور ان سے جو نقصان ان کے آبائی دین کو پہنچ رہا تھا' اس پر جناب ابو طالب سے شکایت کی تو انھوں نے حضور ؐ کو بلایا اور محبت بھرے لہجہ میں کہا: اے جان برادر! تمھارے قبیلے کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور انھوں نے مجھ سے اس طرح کی باتیں کیں (اور وہ باتیں بیان کیں جو انھوں نے کہی تھیں) خدارا مجھ پر رحم کرو اور خود اپنی جان پر بھی رحم کرو۔ مجھ پر ایسا بار نہ ڈالو جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔

راوی کا گمان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ ایسا احساس ہوا کہ ان کے چچا ان کی دستگیری سے اب مجبوراً دست کش ہو رہے ہیں اور ظالموں اور آپ ؐ کے درمیان وہ حائل نہ رہیں گے۔ حضور ؐ کی زندگی کا یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ ایک طرف کفر کی طاقت اور عداوت تھی تو دوسری طرف دنیوی اختیار سے بے بسی اور بے سروسامانی۔ ان حالات میں جو واحد مادی سہارا تھا وہ بھی اب ہمت ہار کر الگ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ حضور ؐ نے اس اندوہناک صورت حال کو شدت سے محسوس کیا اور آپ ؐ کا دل بھر آیا اور آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ یہ ایک فطری عمل تھا لیکن غم و اندوہ کے ان لمحات میں بھی آپ ؐ نے خداوند تعالیٰ کے سہارے ہی کو اپنے لیے سب سے زیادہ مضبوط سہارا سمجھا اور عزم و یقین کے ساتھ فرمایا:

> چچا جان! قسم ہے خدا کی اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج بھی رکھ دیں اور بائیں ہاتھ پر چاند اور مجھ سے اس کام سے باز رہنے (کا مطالبہ) کریں تو میں اسے کبھی نہ چھوڑوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اسے غالب کر دے یا میں (اس جدوجہد) میں اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دوں۔ (ابن ہشام' جلد ۱' ص ۲۶۶)

جناب ابو طالب' حضور ؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ان الفاظ سے بڑے متاثر ہوئے اور کہا: "جان عزیز! جہاں جس طرح تمھارا جی چاہتا ہے دعوت دین کا کام کرتے رہو۔ میں تمھاری

معاونت سے کبھی دست بردار نہ ہوں گا"۔

حضورؐ نے اپنے چچا کے ان احسانات کو ہمیشہ یاد رکھا۔ دنیاوی معاملات میں بڑی خوش دلی سے ان کا ہاتھ بٹایا، روپے پیسے سے ان کی مدد کی، ان کے بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر توجہ دی، ان کے سامنے ہر موزوں موقع پر دین کی دعوت پیش کی تاکہ وہ مسلمان ہو کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔ حضورؐ اپنے چچا کی آخرت سنوارنے کے بارے میں کس قدر فکر مند تھے، اس کا اندازہ حضورؐ کی اس پر زور التجا اور دعا سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ نے جناب ابو طالب کی وفات کے وقت ان کے سامنے کی اور ان کی وفات کے بعد خدا کے حضور میں ان کی مغفرت کے لیے کرتے رہے۔ اس التجا اور دعا میں حضورؐ کے اپنے چچا کے بارے میں جذبات کی اچھی طرح عکاسی ہوتی ہے۔

مسند احمد، بخاری، مسلم اور نسائی میں ہے کہ جب جناب ابو طالب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس تشریف لے گئے۔ ابو جہل اور عبداللہ بن امیہ بھی وہاں موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا: چچا جان، آپ ایک مرتبہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ تو کہہ دیجیے تاکہ مجھے خدا کے سامنے آپ کی شفاعت اور سفارش کے لیے ایک حجت اور دلیل مل جائے۔ ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ باپ کے دین کا واسطہ دے کر انھیں کلمہ شہادت پڑھنے سے تاکیداً باز رکھتے رہے اور حضورؐ بار بار انھیں زبان سے کلمہ شہادت ادا کرنے کی التجا کرتے رہے۔ مگر وہ نہ مانے اور انھوں نے عبدالمطلب ہی کے دین پر دنیا سے رخصت ہونا پسند کیا۔ ان کی وفات کے بعد حضورؐ اپنے چچا کے لیے مسلسل دعائے مغفرت مانگتے رہے، یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ نے اس سے منع فرما دیا۔

حضورؐ اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؓ سے بھی بڑا جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کی معاونت اور دستگیری کو حضورؐ نے ہمیشہ یاد رکھا۔ جب انھوں نے وفات پائی تو آپ بڑے آزردہ خاطر ہوئے۔ ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد حضورؐ کے دل میں ان کی محبت اور احترام آخری دم تک موجود رہا۔ جب کبھی ان کا ذکر آتا تو آپؐ مغموم ہو جاتے اور بسا اوقات آپؐ کے جذبات خلیج چشم سے آنسوؤں کی صورت میں بہ نکلتے۔ جب بھی ان کی کوئی چیز سامنے آتی تو آپ کا دل بھر آتا۔ حضرت ابو العاص جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے اور داماد تھے، جنگ بدر میں گرفتار ہوئے اور اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ روانہ کیا تو حضرت زینبؓ نے اپنے شوہر ابو العاص کے فدیے میں اپنا وہ ہار بھیجا جو حضرت خدیجہؓ نے شادی کے وقت انھیں دیا تھا۔ حضور سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس ہار کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور صحابہؓ سے فرمایا: "اگر مناسب سمجھو تو اس ہار کو واپس کر دو اور اس قیدی کو چھوڑ دو"۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول ہے کہ مجھے حضورؐ کی ازواج مطہرات میں کسی اور زوجہ محترمہ پر اتنا

رشک نہیں آتا تھا جتنا حضرت خدیجہؓ پر۔ حضورؐ ان کی سہیلیوں کو وقتاً فوقتاً تحائف بھیجتے اور ان کا کثرت سے تذکرہ فرماتے۔ ایک مرتبہ میری زبان سے یہ الفاظ نکل گئے: "آپؐ کے دل و دماغ پر تو خدیجہؓ ہی چھائی رہتی ہیں"۔ اس پر آپؐ رنجیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا: "ہاں ان کی محبت کی خود اللہ نے میرے دل میں آبیاری کی ہے۔ وہ مجھ پر اس وقت ایمان لائیں جب دوسرے لوگوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ جب لوگوں نے میرے دعوۂ نبوت کو جھٹلایا تو انھوں نے میری تصدیق کی۔ جب دوسرے لوگوں نے مجھے ہر چیز سے محروم رکھنے کی کوشش کی تو انھوں نے میری دستگیری کی"۔ (بخاری، مسلم اور مسند احمد بن حنبل)

جناب ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات سے حضورؐ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ آپؐ نے ان کے سال وفات کا نام ہی عام الحزن رکھ دیا تھا۔ لیکن ان الم ناک حوادث سے دوچار ہونے کے باوجود آپؐ دعوت دین کے لیے پاپیادہ ہی مکے سے نکل کھڑے ہوئے اور طائف تک راستے میں جتنے قبائل آباد تھے، سب کو اللہ کا پیغام سناتے چلے گئے۔ طائف پہنچنے پر آپؐ وہاں کے مشہور قبیلہ بنو ثقیف کے سرداروں عبدیالیل، مسعود اور حبیب سے ملے اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ ان میں سے ایک بولا: میں کعبہ کے سامنے داڑھی منڈوا دوں گا اگر اللہ نے تجھے رسول بنایا ہو۔ دوسرے نے کہا: کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور رسول بنانے کو نہ ملا جس کو سواری تک میسر نہیں۔ اسے اگر رسول بنانا ہی تھا تو کسی حاکم اور سردار کو بناتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس طعنہ زنی اور بے ہودہ باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور تبلیغ دین میں برابر منہمک رہے۔ اس سے یہ سردار جھلا اٹھے اور انھوں نے شہر کے چھوکروں اور اوباش لوگوں کو حضور سرور عالمؐ کو تنگ اور زچ کرنے پر اکسایا۔ چنانچہ عقل کے ان اندھوں نے آپؐ کو گالیاں دیں، تالیاں پیٹیں اور آپؐ پر پتھر پھینکے۔ آپؐ اس سنگ باری کے باعث لہو سے تربتر ہو گئے۔ خون بہہ بہہ کر جوتوں میں جم گیا اور وضو کے لیے پاؤں جوتے سے نکالنا مشکل ہو گیا۔ اس سفر میں آپؐ کو بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ایک شخص بھی مسلمان نہ ہوا۔ ان حوصلہ شکن حالات میں جب ایک مقدس ہستی بھٹکے ہوئے لوگوں کو حق کی راہ دکھا رہی ہو اور وہ اس کے بدلے میں گالیوں اور پتھروں سے اس کی تواضع کر رہے ہوں اور اس کی زندگی کے درپے ہوں، انسان کے دل پر جو گزرتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ آدمی رنجیدہ خاطر ہوتا ہے، اس ظلم کے خلاف اس کے دل سے آہ نکلتی ہے، وہ ظالموں کو کوستا ہے اور انسان اس انداز پر سوچنے لگتا ہے کہ کیوں نہ حق کے ان باغیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور خدائی فیصلے کا انتظار کیا جائے؟ مگر ان حالات میں رحمت اللعالمینؐ نہ تو

برہم ہوئے نہ مایوس بلکہ اپنے رب کے حضور یوں دعاگو ہوئے:

الٰہی اپنی کمزوری ' بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر پر تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں۔تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ' درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آئے؟ یا کسی دشمن کو میرے اوپر قابو دے رکھا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے پھر کسی چیز کی پرواہ نہیں۔لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔میں تیری ذات کے نور میں پناہ چاہتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر اترے یا تیری ناراضی مجھ پر وارد ہو۔مجھے تیری ہی رضا اور خوشنودی درکار ہے۔اور کوئی طاقت تیری طاقت کے سوا نہیں ہے۔(زاد المعاد 'جلد ۲' ص ۱۲۳ ' ۱۲۴)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر غمگین و رنجیدہ دیکھ کر جبرائیل امین تشریف لائے اور کہا: آپ ؐ کی قوم نے آپ سے جو ناروا سلوک کیا ہے۔اللہ نے اسے دیکھ لیا ہے۔اگر آپ ؐ چاہیں تو ان ظالموں کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس دیا جائے۔لیکن اس غم و اندوہ کے عالم میں بھی حضور سرور دو عالم ؐ نے یہ جواب دیا کہ:

نہیں ایسا ہرگز نہ کیا جائے۔مجھے اللہ سے امید ہے کہ مولائے کریم ان کی نسلوں میں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے۔(زاد المعاد از ابن قیم 'جلد ۲' ص ۱۲۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے جان نثار شعب ابی طالب میں مسلسل تین سال تک محصور رہے اور اس مدت میں قریش نے جس طرح ان پر عرصہ حیات تنگ کیا وہ ایک دل دہلا دینے والی داستان ہے۔مگر حضور ؐ نے خداداد بصیرت کے ذریعے رنج و محن کے ان سالوں کو بھی تربیت کا دور بنا دیا اور شعب ابی طالب کی تربیت گاہ میں ساتھیوں کی اچھی طرح تربیت کی تاکہ مستقبل قریب میں انھیں جس قسم کی مشکلات پیش آنے والی ہیں وہ ان سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکیں۔جو ہستی بھوک ' پیاس ' معاشرتی مقاطعے اور قید کے لرزہ خیز مصائب کے اندر اپنے رفقا کے حوصلے بلند رکھنے کا التزام کرتی ہے اور ان کے ذریعے ان میں سیرت و کردار کی پختگی پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے ' وہ کس قدر عظیم ہو گی؟

قریش نے جب یہ دیکھا کہ حضورؐ اور آپؐ کے فدائیوں کے خلاف ترغیب و ترہیب کا کوئی ہتھیار کارگر ثابت نہیں ہو رہا اور دعوت دین کا کام ان کی ساری ستم رانیوں کے باوجود مسلسل آگے بڑھ رہا ہے تو وہ حضورؐ کے قتل کے درپے ہوئے۔ ادھر حضورؐ سرور دو عالم نے بھی حالات کی نزاکت کو پوری طرح بھانپ لیا اور یہ محسوس کر لیا کہ سرزمین مکہ دین حق کو ایک اجتماعی قوت میں ڈھالنے کے لیے موزوں نہیں، اس کے لیے کسی اور جگہ کی تلاش ضروری ہے۔ چنانچہ آپؐ نے مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کا فیصلہ کیا۔ کفار مکہ کو بھی آپؐ کے اس ارادے کا علم ہو گیا اور انھوں نے ہر قبیلے کے ایک ایک آدمی کو جمع کر کے انھیں یہ حکم دیا کہ وہ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ساتھ حملہ کر کے (معاذ اللہ) ان کا کام تمام کر دیں تاکہ وہ چشمہ عرفان ہی باقی نہ رہے۔ جبرائیل امین کے ذریعے حضورؐ کو بھی ان کے ان ناپاک عزائم کی اطلاع ہو گئی۔ جس رات حضورؐ نے مکہ چھوڑنے کا ارادہ کیا وہی رات اعدائے دین نے حضورؐ پر قاتلانہ حملے کے لیے منتخب کی۔ ان حالات میں حضورؐ کی جذباتی کیفیت پر غور کریں۔ جس سرزمین میں آپؐ نے جنم لیا، عہد طفولیت گزارا، جوان ہوئے، رشتہ مناکحت استوار کیا، نبوت سے سرفراز فرمائے گئے اور جس میں قدم قدم پر آپؐ کے بزرگوں کی یادگاریں موجود تھیں اور سب سے بڑھ کر جو خطہ ارضی بیت اللہ کی موجودگی کی وجہ سے روحانیت کا مرکز و محور تھا، اسے حضورؐ محض خالق کائنات کی خوشنودی کی خاطر خیرباد کہہ کر ایک اجنبی جگہ اور اجنبی ماحول میں آباد ہونے کے لیے جا رہے تھے۔ مکہ کو الوداع کہتے ہوئے حضورؐ کی قلبی کیفیت کا اندازہ ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو آپؐ نے اس موقع پر ارشاد فرمائے:

> خدا کی قسم تو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے۔ اور سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے۔ اگر میں نکالا نہ جاتا تو کبھی نہ نکلتا۔ (ترمذی) تو کیا ہی پاکیزہ شہر ہے اور مجھ کو بڑا ہی محبوب ہے۔ اگر میری قوم مجھ کو نہ نکالتی تو میں دوسری جگہ سکونت اختیار نہ کرتا۔
>
> (احمد و ترمذی)

پھر شہر سے نکلنا بھی انتہائی پرخطر تھا۔ خواب گاہ کو خون کے پیاسوں نے اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا کہ کوئی جائے فرار نہ تھی۔ الغرض ہر طرف آلام اور تفکرات ہی تھے۔ گھربار چھوڑنے کا غم قرابت داروں کی جدائی کا غم، اپنے کمزور اور بے بس جاں نثاروں کے ظالموں کی تحویل میں رہ جانے کا غم، بیت اللہ سے بعد اور دوری کا غم اور دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے مختلف قسم کی پریشانیاں اور اندیشے لاحق تھے۔ اس قسم کے المناک حالات میں بھی اللہ کے برگزیدہ نبیؐ نے سکون خاطر برقرار رکھا۔ اس امینؐ کے پاس جو امانتیں رکھی ہوئی تھیں انھیں اپنے عم زاد بھائی کے ذریعے ان کے مالکوں

تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام فرمایا اور بڑے وقار اور اعتماد کے ساتھ اپنے فدائی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ قریش کو جب اپنے منصوبے کی ناکامی کا علم ہوا تو انھوں نے آپ ؐ کے تعاقب میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے حتیٰ کہ وہ ایک غار کے دھانے تک جا پہنچے جہاں آپ ؐ پناہ گزین تھے۔ اس اثنا میں آپ ؐ کے جان نثار رفیق ؓ نے گھبرا کر کہا: "حضور ؐ ان میں سے اگر کسی کی نظر اپنے قدموں پر پڑ جائے تو ہم اس کی نگاہ سے بچ نہ سکیں گے"۔
آپ ؐ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا:
نیز آپ ؐ نے یہ بھی فرمایا: اے ابوبکر ان دو آدمیوں کے متعلق تمھارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔

لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا

تو بالکل غم نہ کھا یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

تکبر اور عجب

افادات امام ابو احمد محمد غزالیؒ

دل اور اخلاق کے امراض میں تکبر اور عجب سب سے زیادہ مہلک ہیں۔ کبائر میں سب سے بڑے گناہ، اخلاق میں بدترین اخلاق، اور بے شمار دوسرے بڑے گناہوں اور برے اخلاق کا سرچشمہ۔ ابلیس نے اپنے کو اللہ کے مقابلے میں بڑا، اپنی رائے کو اس کے حکم کے مقابلے میں زیادہ صحیح، اور اپنی ذات کو آدم کے مقابلے میں برتر (اَسۡتَکۡبَرَ اور اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ) بس اسی کبر کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ملعون و مردود اور ہلاک و برباد ہو گیا۔ اللہ کی ہدایات کے مقابلے میں تکبر کرنے والے آسمان کے دروازوں اور جنت میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے، یہ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا (الاعراف ۷: ۴۰)۔ ارشاد فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے: جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی کبر ہو گا، وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا (مسلم)۔ مزید فرمایا: تین چیزیں آدمی کو بالکل ہلاک کر دینے والی ہیں: دل کی تنگی جس کے تقاضے وہ پورے کرے، خواہش نفس جس کے پیچھے وہ چلے، اور اپنے نفس کو بڑی چیز سمجھنا (بیہقی، طبرانی)۔

کبر کے مقابلے میں تواضع ہے، جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: جو تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا مقام بلند کرتا ہے (مسلم)۔ حضرت عائشہؓ نے کہا: تم افضل عبادت سے غافل ہو! وہ تواضع ہے۔ منقول ہے کہ حضرت موسیٰؑ پر اللہ تعالیٰ نے وحی کی: جو میری عظمت کے آگے پستی اختیار کرے اور میرے بندوں پر بڑا نہ بنے، اسی کی نماز میں قبول کرتا ہوں۔ فضیل بن عیاضؒ سے پوچھا گیا کہ تواضع کیا ہے فرمایا: حق بات کے آگے جھک جانا، اگرچہ کسی جاہل یا لڑکے سے سنے۔ حضرت حسنؒ نے پوچھا: تمھیں معلوم ہے کہ تواضع کیا ہے، پھر فرمایا: تواضع یہ ہے کہ جب آدمی گھر سے نکلے اور کوئی مسلمان راستے میں ملے، تو اس کو سمجھے کہ یہ مجھ سے اچھا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے پاس ایک روز چند اہل قریش اپنے اوپر فخر کرنے لگے۔ فرمایا: میرا حال پوچھتے ہو تو یہ ہے

کہ ناپاک پانی سے پیدا ہوا ہوں اور آخر کار بدبودار مردار بن جاتا ہے۔ پس اگر میزان میں پلہ بھاری رہا تو اچھا ہوں' اور اگر ہلکا رہا تو برا ہوں۔

تکبر کا مرض بہت عام ہے۔ عام لوگوں اور دنیاداروں کا کیا ذکر' عالم' عابد و زاہد' اور اصلاح و دعوت کے مدعی بھی کم ہی اس سے خالی ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی حقیقت کو جاننا' اس سے خبردار رہنا' اپنے دل اور اعمال پر نگاہ رکھنا اور انھیں کبر سے پاک کرنے میں لگے رہنا' ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔

کبر اور عجب کی حقیقت

تکبر اور عجب درحقیقت دل کے روگ ہیں۔ تکبر کے جو ظاہری اعمال سرزد ہوتے ہیں' وہ باطنی امراض ہی کے ثمرات ہیں۔ اس لیے علاج کرنا ہو تو ان کو دل سے جڑ سے اکھاڑنے کی فکر کرنا چاہیے۔

عجب' یا خود پسندی اور انانیت' یہ ہے کہ تم اپنے مقام و مرتبے کو بڑی چیز سمجھو' اور اپنی رائے' علم و عمل' حسب و نسب یا قوت و مال پر ناز کرو۔ عجب سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔ جب تم اپنے مرتبہ اور مقام کو دوسروں کے مقابلے میں بہتر و برتر بھی سمجھنے لگو اور اپنے کو دوسروں پر فائق دیکھ کر لذت اور راحت پاؤ' تو یہ تکبر ہے۔

اندر کی ان بیماریوں سے جو اعمال ظاہر میں صادر ہوتے ہیں' ان کا شمار ناممکن ہے۔ ان تمام اعمال کا خلاصہ یہ ہے کہ تم دوسروں کو کم تر اور حقیر و ذلیل جانو: ان کی تحقیر و تذلیل کرو' اور ان سے دور رہو۔ ان کے ساتھ اور ان کے برتنوں میں کھانا پینا عار سمجھو بلکہ اپنے برتن بھی انھیں استعمال نہ کرنے دو۔ وہ راستوں میں برابر چلیں' مجلسوں میں اونچی جگہ بیٹھیں' تو تمھیں سخت ناگوار ہو۔ تمھیں کوئی نصیحت کرے تو نفس پر سخت چوٹ لگے' ناک بھوں چڑھاؤ' تلخ و طعن آمیز جواب دو' اور نصیحت کرنے والے کی تذلیل کرو۔ خود نصیحت کرو تو تند مزاجی سے کرو' غلطی کرنے والے کو ٹوکو تو درشتی کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرو' سیکھنے والے پر نرمی نہ کرو۔ عوام کو ایسا سمجھو کہ وہ سب گدھے ہیں۔ صرف اپنی رائے کو حق سمجھو' اس کے غلط ہونے کا امکان بھی نہ دل میں آئے' اور باقی سب کو باطل۔

کبر کی وجہ سے جنت کے دروازے اس لیے بند ہو جاتے ہیں کہ تمام اخلاق حسنہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ جب تک تمھارے دل میں عجب و کبر ہو گا تم اپنی آن اور انا کی وجہ سے نہ نیکی کرو گے' نہ برائی سے بچ سکو گے' نہ سچی بات قبول کر سکو گے' نہ غصہ پینے پر قادر ہو گے' نہ حسد ترک کر سکو گے' نہ غیبت و تحقیر سے بچ سکو گے' نہ نصیحت پر کان دھرو گے۔ حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں: آدمی کے لیے صرف یہی گناہ کافی ہے کہ جب کوئی اس سے کہے کہ خدا سے ڈرو' تو وہ جواب دے'

میاں اپنے کام سے کام رکھو' اپنی فکر کرو' مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

علم و تقویٰ پر عجب و تکبر

عالم و زاہد کو اکثر اور جلد اپنے علم اور زہد و تقویٰ کا زعم ہو جاتا ہے' اور وہ بہت زیادہ تکبر میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ منتظر رہتا ہے کہ لوگ مجھے پہلے سلام کریں' مجھ سے جھک کر ملیں' مجھے وعظ و تقریر کے لیے بلائیں' میرے ہاتھ چومیں' مجھے مجلسوں میں اونچی جگہ بٹھائیں' مجھے تقریر کے لیے بہترین وقت دیں' تقریر کتنی ہی طویل کروں مجھے نہ ٹوکیں' میرا سامان اپنے ہاتھوں میں اٹھائیں' میرے لیے عزت و اکرام کے الفاظ استعمال کریں۔ اگر یہ توقعات پوری نہ ہوں' یا ان میں کسر رہ جائے' تو وہ سخت غضب ناک ہوتا ہے۔

اگر خود کسی کو پہلے سلام کر لیا' کسی کی تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا' کسی کی دعوت قبول کر لی' تو اس کو اپنا کمال اور اس شخص پر اپنا احسان جانتا ہے' اور اس کے بدلے میں شکر گذار ہونا اس پر لازم سمجھتا ہے۔ اگر کسی سے اس کی خدمت میں کوتاہی ہو جائے تو برا مانتا ہے' گویا سب اس کے غلام ہیں۔ تعلیم کیا دیتا ہے' وعظ کیا کہتا ہے' عبادت کیا کرتا ہے' گویا خلق پر احسان کرتا ہے۔ لوگوں کے گمراہ ہو جانے یا مبتلائے عذاب ہو جانے کا اندیشہ اور فکر زیادہ کرتا رہتا ہے' ان کو ڈرانے اور دھمکانے میں بھی کمی نہیں کرتا' اپنے بارے میں خوف نہیں کرتا' بلکہ دل ہی دل میں دوسروں کی بہ نسبت اپنے لیے نجات کی توقع زیادہ رکھتا ہے۔ حالانکہ حقیقی علم سے خشوع اور تواضع میں اضافہ ہوتا ہے' اور زہد کا تقاضا یہ ہے کہ سب آدمیوں کو اپنے سے بہتر جانے۔

اگر کسی نے اس کی سبکی کی' برا بھلا کہا' اسے ایذا پہنچائی' تو اسے معاف کرنا اس کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ اور اگر اتفاقاً ایذا پہنچانے والے پر کوئی رنج و مصیبت آجائے' تو اسے اپنی کرامت سمجھتا ہے کہ دیکھا' خدا نے ہمارا بدلہ لے لیا۔ یہ جاہل' بیوقوف' متکبر یہ نہیں دیکھتے کہ بہتوں نے اللہ اور رسولؐ کو گالیاں دیں' انبیاؑ کو مار بھی ڈالا' مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں مہلت دی اور عذاب نہ دیا۔ بلکہ بعض ایمان لے آئے' انھیں نہ دنیا میں نقصان پہنچا نہ آخرت میں۔

خلاصہ یہ کہ تمھیں یہ گمان ہو کہ میں کسی بھی بندے سے بہتر ہوں' تو تم نے اپنے سب عمل برباد کیے۔ اس گمان و یقین کا ایک درجہ یہ ہے کہ دل میں ہو' مگر کوشش کر کے متکبرانہ اعمال سے بچو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ کبر کے افعال بھی کرو۔ مثلاً آگے آگے چلو' لپک کر صدر مقام پر بیٹھو' اور کوئی تمھاری خدمت و عزت میں کوتاہی کر دے تو برا مانو' منہ پھیر لو' ترش رو ہو جاؤ' ماتھے پر شکن آجائے۔ جو ایسا کرے' اس بیچارے کو خبر نہیں تقویٰ ماتھے میں نہیں کہ اس میں شکن ڈالے' نہ چہرے

میں کہ اسے ترش کرے' نہ گردن میں کہ اسے جھکا دے' نہ دامن میں کہ اسے سمیٹ لے۔ تقویٰ تو دلوں میں ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ کبر زبان سے ظاہر ہو۔ مثلاً عالم اپنے مخاطب سے کہے' کہ میں علم رکھتا ہوں' استادوں میں سے فلاں فلاں کو دیکھا ہے' تم کون ہو اور تمھاری لیاقت' حیثیت کیا ہے۔ تم نے حدیث و قرآن بھی پڑھا ہے؟ مناظرہ میں کوشش کرتا ہے کہ دوسرے کو ہرادوں' میں نہ ہاروں۔ حدیث کے الفاظ اور اسناد یاد کرتا ہے تاکہ ہمسروں پر رعب بیٹھے۔ کسی سے قرات' الفاظ' اسناد میں غلطی ہو' تو دل ہی دل میں خوش ہو کہ مجھ کو غلطی بتانے اور اپنی برتری ثابت کرنے کا موقع مل گیا۔ گرفت اس طرح کرے کہ سب کے سامنے دوسرے کی کم تری ظاہر ہو۔ کوئی صحیح بیان کرے' بہتر وعظ کہے' تو برا لگے کہ لوگ اس کو میری بہ نسبت بڑا نہ سمجھ لیں۔ بعض دفعہ دوسروں کے بہت سے عیوب بیان کر کے پھر اپنی تعریف کرے: فلاں شخص صبح کو سو رہتا ہے' میں تو روز فجر اول وقت جماعت سے پڑھتا ہوں۔ کبھی کہے' میں نے تو آج تک ایسا کبھی نہیں کیا' گویا اپنی برتری جتائے۔ بعض دفعہ عبادت میں زیادتی اس خوف سے کرے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ اس کی نسبت فلاں شخص زیادہ عبادت گزار ہے۔

یہ سب اعمال اس کبر کے اعمال ہیں جو علم اور زہد و تقویٰ کے زعم سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کا مقصد اپنی بڑائی (یعنی عجب) اور دوسرے کی تحقیر یعنی تکبر ہے۔

جب حسب و نسب اور طاقت و دولت کی وجہ سے تکبر پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی زبان پر آتا ہے' عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔ نسب والا کہتا ہے: تیرا کیا مقام کہ میرے سامنے بولے' تو ہم جیسوں سے بولتا ہے' تیرا باپ کون ہے' تجھے پتہ نہیں میں کس باپ کا بیٹا ہوں۔ دولت مند کہتا ہے: تیری اصل کیا ہے' تو بھک منگا ہے' میں چاہوں تو تجھ جیسے دس خرید لوں' اچھے اچھے میری خدمت کرتے ہیں۔

وضع اور عادات میں کبر

آدمی وضع اور عادات میں بھی تکبر کرتا ہے: جیسے منہ پھلانا' انکھیوں سے دیکھنا' اکڑ کے بیٹھنا' چال ڈھال میں اکڑ کر چلنا' وغیرہ وغیرہ۔ بعض کی عادت ہوتی ہے کہ لوگ ہماری تعظیم کے لیے کھڑے ہو جایا کریں۔ بعض اس وقت تک نہیں چلتے جب تک پیچھے پیچھے آدمی نہ چلیں۔ ایک عادت یہ ہے کہ کوئی پہلو میں بیٹھ جائے تو برا لگے' سامنے بیٹھے تو مضائقہ نہیں۔ ایک عادت یہ ہے کہ بیماروں کے پاس نہ بیٹھے اور ان سے احتراز کرے۔ ایک عادت یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے گھر کا کوئی کام نہ کرے' گھر کا سودا سلف اپنے ہاتھ میں اٹھا کر لانے میں عار محسوس کرے۔ کبھی لباس کی نفاست کبر کی وجہ سے ہوتی ہے' کبھی ادنیٰ لباس کبر کے واسطے پہننا ہوتا ہے۔ بعض کھدر پہننے والے ریشم پہننے والوں کے مقابلے میں

متکبر ہوتے ہیں۔ مزنی" کہتے تھے: کپڑے بادشاہوں کے سے پہنو مگر دلوں کو خوف خدا سے نرم رکھو۔

تکبر اور عجب کا علاج

دل سے تکبر کی جڑ اکھاڑنے کے لیے ایک علاج علمی ہے یعنی تم اپنے نفس کو اور اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح پہچانو۔ تمھیں یقین ہو کہ تمھارا نفس تمام ذلیلوں سے ذلیل تر اور سب کم مایہ چیزوں سے زیادہ بے مایہ ہے' اور حسب نسب اور علم و زہد کے لحاظ سے' اس کے حال کے مناسب سوائے ذلت اور تواضع کے اور کچھ نہیں۔ اس کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ قرآن مجید کی ان آیات کے معنی جان لے جو اس کی اصل حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔ یا ایک ہی آیت کے معنی جان لینا بھی کافی ہو سکتا ہے: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ..... اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (عبس ۸۰: ۱۷-۲۲)۔ فرض کرو ایک مجرم ہزار کوڑے کی سزا کا مستحق ہے' اور ایک جیل میں قیدی ہے' پتہ نہیں کب اور کیا فیصلہ ہو گا۔ کیا وہ شخص دوسرے قیدیوں پر تکبر کرے گا' یا اپنی جان کی فکر میں ڈوبا رہے گا!

عملی علاج یہ ہے کہ علانیہ' مشقت اور ریاضت کر کے' صرف خدا کے واسطے' تواضع کی روش اختیار کرو۔ حضور ؐ زمین پر کھانا کھاتے اور فرماتے کہ میں بندہ ہوں' زمین سے لقمہ اٹھا کر کھا لیتے' کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ لیتے۔ سلام میں پہل کرتے' خصوصاً بچوں اور عورتوں کو' اپنے سے کم تر لوگوں کو' ان کو آگے رکھتے' مجلس میں اچھی جگہ بٹھاتے۔ جو فعل کبر کا ہو' ہمیشہ اس کے خلاف کرو۔ اعضا کے عمل کی تاثیر دل پر ضرور ہوتی ہے۔

علم و عقل اور زہد و عبادت کے کبر کا علاج آسان نہیں' نہایت محنت و شدت سے ہی ممکن ہے۔ اس کبر کے علاج کے لیے دو باتیں اچھی طرح یاد رکھو: ایک یہ کہ جتنا علم زیادہ ہو گا' اتنا ہی اللہ کی طرف سے حساب اور مواخذہ زیادہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے عالم بے عمل کو گدھے اور کتے سے تشبیہ دی ہے۔ عالم کو نہ چاہیے کہ وہ اپنے کو صحابہ سے بڑھ کر سمجھے۔ دیکھو' ان میں سے بعض فرماتے کہ کاش میری ماں مجھے نہ جنتی' اور بعض کہتے کاش میں گھاس کا تنکا ہوتا۔

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ عالم و عابد اپنے نفس کو فاسق اور بدعتی سے کم تر کیسے سمجھے؟ عالم' کافر پر تکبر اس لیے نہیں کر سکتا کہ ہو سکتا ہے کافر ایمان لائے اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہو' اور عالم گمراہ اور کافر ہو کر مرے۔ بس اصل بڑائی تو آخرت کی ہے' اور اس کا حال معلوم نہیں۔ اسی طرح جاہل کو دیکھے تو سوچے کہ اس نے تو جہالت کے باعث اللہ کی نافرمانی کی' اور میں نے جانتے بوجھتے نافرمانی کی۔ عالم کو

دیکھے تو سوچے یہ مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اصل علاج یہ ہے کہ تمام توجہ اپنے نفس کے گناہوں اور اس کے انجام کی طرف مبذول کرے ' اپنے خاتمے کا خوف کرے ' دوسرے کے خوف میں مشغول نہ ہو۔

رائے کا عجب

اپنی رائے پر زعم کرنا' صرف اس کو برحق سمجھنا اور اس کے علاوہ ہر رائے کو باطل سمجھنا' اپنی رائے کے مانے جانے پر اڑ جانا' یہ رائے کا عجب ہے۔ اسی سے گھر میں' اجتماعیت میں فساد اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ غلط رائے پر عجب امت کے آخر زمانے میں بہت ہو گا۔ یہ ایسی بلا ہے کہ اس سے پہلی قومیں تباہ ہوگئیں کیونکہ اسی سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں۔

ہر ایک سمجھتا ہے کہ میں ہی صحیح جانتا ہوں۔ جان لو کہ رائے کے عجب کا علاج عجب کی دوسری صورتوں کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ اس لیے کہ جس کی رائے غلط ہے وہ اپنی رائے کی غلطی سے ناواقف ہے۔ واقف ہو تو اسے ترک کر دے۔ بس جس بیماری کو جانتا ہی نہیں اس کا علاج کیسے ہو گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک بلا مسلط کر دی ہے جو بربادی کی موجب ہے۔ خود کو برحق سمجھنے والا' اپنے عجب کو نعمت سمجھتا ہے' سعادت اور کامیابی کا سبب خیال کرتا ہے' وہ اس سے نجات کیسے پائے گا۔

مختصر علاج یہ ہے کہ کبھی اپنی رائے کو غلطی کے امکان سے خالی نہ سمجھے' اپنے علم و عقل اور دلائل کو قرآن و سنت کا مقام نہ دے' اپنی رائے پر اڑنے سے بچے' سلف کا طریقہ اختیار کرے' کتاب اللہ اور حدیث رسول ؐ کے فیصلوں کے آگے گردن جھکا دے' اور سب مسلمانوں کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آئے۔

(مرتبہ: خرم مراد۔ ماخوذ از احیاے علوم الدین' ج ۳)

مذاکرہ

پاکستان کی خارجہ پالیسی

پاک امریکہ تعلقات، نیوکلیر صلاحیت، کشمیر

خارجہ پالیسی کے مسائل پاکستان کے لیے زندگی اور موت کے مسائل ہیں۔ ان مسائل پر صحیح پالیسیاں اور تدابیر اختیار کی جائیں، اس سے ہر دردمند پاکستانی کو گہری دلچسپی ہے۔ سکڑتی ہوئی دنیا میں پاکستان جیسے چھوٹے ملک کو ویسے بھی امریکہ، روس اور بھارت جیسی بڑی طاقتوں کے دباؤ اور دست برد سے اپنی سلامتی اور مفادات کو محفوظ رکھنا بہت مشکل تھا، واحد سپرپاور کی دنیا نے یہ اور مشکل کر دیا ہے، اور اس کا اندرونی سیاسی عدم استحکام اور انتشار اور معاشی بدحالی اس راہ میں سنگ گراں بن گئی ہیں۔ اس پر مستزاد نااہل اور قومی مفادات سے غافل قیادت۔ آزادی کے وقت سے ہی پاک امریکہ تعلقات ہماری خارجہ پالیسی کا محور رہے ہیں، اور اب ربع صدی سے یہ تعلقات نیوکلیر صلاحیت کے محور پر بگڑتے جا رہے ہیں۔ موجودہ حکومت ان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ہر معاملے پر امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کے لیے اور بساط عالم پر اس کا مہرہ بننے کے لیے آمادہ نظر آتی ہے۔ ان حالات میں ہر دردمند پاکستانی تشویش کا شکار ہے۔

ان مسائل پر ہم ملک کی ایسی چار شخصیتوں کے خیالات پر مشتمل ایک مذاکرہ پیش کر رہے ہیں جو صرف دانش ور اور ماہرین نہیں ہیں بلکہ جن میں سے بعض کے ہاتھوں میں خارجہ پالیسی کی باگیں بھی رہی ہیں، اور وہ اس کی نزاکتوں اور خطرات سے خوب واقف ہیں۔ جناب آغا شاہی امور خارجہ کے سکریٹری (۱۹۷۳ تا ۱۹۸۰) اور وزیر (۱۹۸۰ تا ۱۹۸۲) رہے۔ جناب عبدالستار کیریر ڈپلومیٹ ہیں اور وہ بھی خارجہ سکریٹری اور وزیر (۱۹۹۳) رہے ہیں۔ جنرل (ر) خالد محمود عارف، جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف تھے، اور جناب فرحت اللہ بابر موجودہ حکومت میں سینیر عہدیدار ہیں۔

جناب فرحت اللہ بابر کے خیالات آئی پی ایس کی کتاب - Foreign Policy Debate The years ahead سے ماخوذ ہیں' جبکہ باقی تین حضرات نے اپنے ان خیالات کا اظہار سینیٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سامنے کیا - (مدیر)

۱- آغا شاہی

سابق وزیر خارجہ پاکستان

پاک امریکہ تعلق میں مد و جزر

پاک امریکہ تعلقات میں نئے رجحانات کا آغاز ۱۹۹۰ء میں اس وقت ہوا جب صدر بش نے پاکستان کے پاس ایٹم بم نہ ہونے کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا - اس کے نتیجے میں ۱۹۸۲ء سے ملنے والی ۶۰۰ ملین ڈالر کی سالانہ فوجی اور اقتصادی امداد بند ہو گئی - تعلقات کشیدہ اس لیے ہو گئے ہیں کہ پاکستان نے اس بات سے انکار کر دیا ہے کہ وہ عدم پھیلاؤ معاہدہ (NPT) پر یک طرفہ دستخط کر دے ' اور' بھارت کرے یا نہ کرے ' اپنی ایٹمی صلاحیت منجمد کر دے بلکہ ختم ہی کر دے - یورینیم افزودگی کے پروگرام کو ۱۹۸۹ء میں معطل کر دیا گیا ' لیکن اس سے امریکہ کی تشفی نہ ہوئی - وہ اس کا خاتمہ چاہتا ہے - اب پریسلر ترمیم لاگو ہے اور ہم ان ایف - ۱۶ طیاروں سے محروم ہیں جن کی قیمت ہم ادا کر چکے ہیں - وزیر اعظم کے دورے سے کچھ بہتری کی امید ہوئی ہے لیکن طیاروں کی فراہمی یا مکمل رقم کی واپسی کا امکان کم ہی ہے -

امریکہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے کہ پاکستان کا نیوکلیر پروگرام بھارت سے تین جنگوں کے پس منظر میں ہماری سلامتی کے لیے ناگزیر ہے - بھارت کی فوجی برتری ہماری سلامتی کے لیے خطرہ ہے - پریسلر ترمیم نے ہمارے روایتی دفاع کی صلاحیت کو نقصان پہنچایا ہے - اس لیے ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ آخری چارہ کار کے طور پر ایٹمی صلاحیت کو ترقی دیں - ہمارے لیے اس کا جواز بھارت یا اسرائیل سے کہیں زیادہ ہے جو اپنے پڑوسیوں پر فوجی برتری رکھتے ہیں -

پاکستان کو اب یہ توقع نہیں کرنا چاہیے کہ ماضی کی سرد جنگ کے دوران یا ۸۰ کے عشرے میں افغانستان کے حوالے سے پائے جانے والے تعلقات دوبارہ قائم ہوں گے - روسی سلطنت کے زوال کے بعد جنوبی ایشیا کی صورت حال میں جو تبدیلی آگئی ہے ' اس کے بعد اس کا کوئی امکان نہیں ' خصوصاً اس لیے کہ صدر کلنٹن "بھارت سے بہتر 'مضبوط تر اور وسیع ترین تعلقات" کا عزم کیے ہوئے ہیں - امریکہ سلامتی کونسل میں بھارت کی مستقل نشست کی کوشش کی حمایت کر رہا ہے اور اس کے ساتھ اسٹرٹیجک شراکت قائم کرنے کی فکر میں ہے - ہمیں امریکہ سے ' اس کی اسرائیل اور ایران

پالیسیوں کے پیش نظر کم تر سطح کے تعلقات پر راضی ہونا ہو گا۔ ماضی میں جب ہمارے امریکہ سے خصوصی تعلقات تھے، امریکی پالیسیوں کی وجہ سے ان تعلقات میں اتار چڑھاؤ کے دور آتے رہے ہیں اور پاکستان ان کا عادی ہو گیا ہے۔ ہندستان کو بھاری اقتصادی امداد اور چین کے ساتھ جنگ کے دوران زبردست فوجی سازوسامان کی فراہمی، ۱۹۶۵ کی جنگ میں پاکستان کی امداد پر بندش، ۱۹۷۱ کی جنگ میں پاکستان کی امداد سے دست کشی، ۱۹۷۸ میں فرانس پر دباؤ ڈال کر ایٹمی پلانٹ کی منسوخی، ۱۹۷۹ میں تمام امداد کا انقطاع، افغانستان کی جنگ ختم ہوتے ہی پریسلر ترمیم کا اطلاق --- امریکہ کی بدلتی ہوئی روش کے چند مظاہر ہیں۔ اس لیے اس کا حالیہ مخالفانہ انداز ہمارے لیے تعجب کا باعث نہیں ہونا چاہیے۔ اگرچہ اب وہ جو سزا دے رہا ہے وہ ماضی کی نوازشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

پاکستان کو ایک خطرناک صورت حال کا سامنا ہے۔ ایک طرف اگر وہ واحد سپر طاقت سے قریبی تعلقات قائم کرنا چاہے تو اسے اپنی سلامتی کو قربان کرنا ہو گا، اور ایٹمی صلاحیت کو لپیٹ کر رکھ دینا ہو گا۔ دوسری طرف اسے سپرپاور کی طرف سے شدید اقدامات کا خطرہ ہے۔ میرے خیال میں اسے اپنی سلامتی کو اور علاقائی تعلقات کو ترجیح دینا چاہیے۔ نئے بین الاقوامی نظام میں اجتماعی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں ہے، اور اگر بھارت ایٹمی حملہ کرے تو کسی ایٹمی طاقت سے مدد کی قابل اعتماد ضمانت بھی نہیں ہے، اس لیے پاکستان کو اپنی سلامتی کے لیے خود اپنے اوپر ہی انحصار کرنا ہے۔ یہی ہمارے ایٹمی پروگرام کی حقیقی اہمیت ہے۔ اس لیے اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم نے ایٹمی متبادل کو یک طرفہ ترک کر دیا، یا یک طرفہ منجمد کر کے اسے مجروح کر لیا تو پاکستان کی سلامتی سخت خطرے میں پڑ جائے گی۔

یورینیم کی پیداوار کا انجماد

جنیوا میں تخفیف اسلحہ کانفرنس میں ایٹمی دھماکے کی صلاحیت رکھنے والے افزودہ یورینیم اور پلوٹینیم کی پیداوار کے مکمل انقطاع پر مذاکرات جاری ہیں۔ ۲، ۳ سال بعد جب معاہدہ نافذ ہو گا تو اس وقت جو قابل انشقاق مواد موجود ہوں گے، وہ اس کی زد میں نہیں آئیں گے۔ بھارت، اسرائیل اور پاکستان جنھوں نے این پی ٹی پر دستخط نہیں کیے ہیں، اس وقت اپنے پاس موجود مواد سے بم بنانے کے لیے آزاد ہوں گے۔ اگر ہماری افزودگی کی صلاحیت ۱۹۸۹ کی سطح پر منجمد رہتی، جو ہم کر چکے ہیں تو اس وقت بھارت کا ذخیرہ ہم سے ۲ گنا یا اس سے بھی زائد ہو گا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کنونشن سے امریکہ کا اصل مقصد بڑی طاقتوں کے اسلحے کی روک تھام نہیں، بلکہ اسرائیل، بھارت اور پاکستان پر قدغن لگانا ہے۔ امریکہ کو اسرائیل سے تو کچھ کہنا نہیں ہے، اس لیے بھارت اور پاکستان رہ جاتے ہیں۔ امریکہ دونوں

ملکوں سے اس سلسلے میں یک طرفہ اقدامات کا تقاضا کرتا رہا ہے۔ ہم ۱۹۸۹ میں 'پابندی کی تاریخ سے کئی برس پہلے ہی 'امریکہ کے دباؤ میں آکر اپنا پروگرام منجمد کر چکے ہیں۔ جب کہ بھارت نے امریکی دباؤ کا مقابلہ کیا ہے' اور وہ ہر سال ۲۵ بموں کی صلاحیت پیدا کر رہا ہے۔ ۱۹۸۹ میں ہمارے پاس ایک بم کی صلاحیت تھی تو اس کے پاس چھ کی تھی۔ ۹۷-۱۹۹۶ میں اس کے پاس ۲۰۰ بموں کی صلاحیت ہوگی' جبکہ ہمارے پاس وہی ۱۰کی رہے گی' کیونکہ پاکستان اپنی پیداوار منجمد کر چکا ہے۔

یہ صورت حال بھارت کے پرتھوی میزائل کے مقابلے میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کی استعداد بلکہ بقا تک کو مشکوک بنا دے گی۔ بھارت نے پاکستان کی تمام اہم دفاعی 'صنعتی اور ترقیاتی تنصیبات کو نشانہ بنانے کے لیے کم سے کم ۱۰۰ ایسے میزائل تیار کرنے کا ہدف پہلے ہی طے کر لیا ہو گا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ پاکستان یورینیم افزودگی کے پروگرام پر عمل کا دوبارہ آغاز کر دے تاکہ عالمی پابندی سے پہلے پہلے ہم بھارت کے مقابلے میں اپنا فرق کم سے کم کر سکیں۔ امریکہ ہماری توانائی کے شعبے میں یا دوسرے منصوبوں میں کتنا ہی سرمایہ لگائے 'ہمیں کچھ روایتی اسلحہ فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائے 'کوئی بات بھی ایٹمی پروگرام کو منجمد رکھنے کی 'بجا اس کو پیچھے لے جانے یا ختم کرنے کی قیمت نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کے لیے لازم ہے کہ وہ ایٹمی مواد کی پیداوار کے انقطاع کے معاہدے کی اصل شکل واضح ہونے تک دستخط کرنے کا پہلے سے ہرگز وعدہ نہ کرے۔ بھارت اور پاکستان دونوں ہی اصولی طور پر انقطاع کے پابند ہیں 'لیکن اصل کھیل تفصیلات میں ہے۔ بھارت کسی وقت بھی اپنے ایٹمی پلانٹ (۵ ریسرچ ری ایکٹر' ۳ پلوٹونیم پلانٹ' ۱ نیوکلیر پاور پلانٹ) بین الاقوامی نگرانی میں نہ دینے کی پالیسی طے کر سکتا ہے۔ ہم نے اس سے پہلے یک طرفہ وعدہ کر کے اپنے ہاتھ باندھ لیے 'تو ہمارا واحد کہوٹہ پلانٹ اس نگرانی کا شکار ہو جائے گا۔

پاکستان کو اپنی ایٹمی پالیسی بھارت کی ایٹمی پالیسی کی مناسبت سے مرتب کرنا چاہیے۔ جنوبی ایشیا کے حوالے سے deterance کی اہمیت ہے۔ اس کا مشاہدہ گذشتہ ۴۰ سال میں مشرق اور مغرب کے تعلقات میں ہو چکا ہے۔ جنوبی ایشیا میں اس کا کردار لڑائی لڑنے کا نہیں 'بلکہ اس سے بچانے کا ہے۔ پہلے نقطہ نظر سے ایٹمی اسلحے کے انبار لگانا ہوں گے جب کہ دوسرے کے مطابق 'کم سے کم سطح پر برابری کی صلاحیت کا حصول جنگ سے محترز رکھے گا اور روایتی اسلحے کی تخفیف اور سیاسی تعلقات کی بحالی میں بھی کردار ادا کرے گا۔

میزائلوں نے حملے کا پہلے سے انتباہ کا دورانیہ چند منٹ کا کر دیا ہے۔ بھارت اور پاکستان کو اپنے اسلحے کو ایٹمی بنانے اور میزائل نصب کرنے کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیے۔

یہاں بھی کلید بھارت کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایسی کوئی علامت نہیں جس سے اس کی جانب سے مثبت ردعمل کی توقع ہو۔

ایٹمی اسلحے میں برابری کے مسائل کے ساتھ ساتھ حکم دینے' رابطہ کرنے اور کنٹرول سی۔ ۳ کے مسائل بھی کسی تاخیر کے بغیر غور و فکر کے مستحق ہیں تاکہ دونوں فریق کسی غلطی یا حادثے کی وجہ سے جنگ میں نہ الجھ جائیں۔ اسی طرح بہت سے دوسرے مسائل ہیں جنھیں اب نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ جتنی جلدی دونوں حکومتیں ان کو طے کر لیں' اتنا ہی ان کے عوام کے لیے اور جنوبی ایشیا کے دوسرے ممالک کے عوام کے لیے بہتر ہو گا۔

۲۔ جنرل (ر) خالد محمود عارف

سابق ڈپٹی چیف آف آرمی سٹاف

تمہید

بنیادی بات یہ ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کو پاکستانی عوام کی امنگوں اور ان کی ethos کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔

ظاہر ہے کسی بھی ملک کی خارجہ پالیسی ان ملکوں کے دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکتی جو اس کے ذریعے اپنے مفادات کا حصول چاہتے ہیں۔ لیکن داخلی طور پر متحد اور معاشی طور پر خوشحال ممالک اس قسم کے دباؤ کا مقابلہ کامیابی سے کر سکتے ہیں' جبکہ ترقی پذیر ممالک مزاحمت کی زیادہ طاقت نہیں رکھتے' خصوصاً پاکستان کی سیاسی محاذ آرائی اور داخلی صورت حال اسے زیادہ ہی کمزور کر رہی ہے۔ جتنا ملک کمزور ہو گا بیرونی دباؤ کا اتنا ہی آسانی سے شکار ہو گا۔ خوشنما اعلانات سے سیاست میں کام چل سکتا ہے' لیکن دفاعی صلاحیت کے بارے میں اس طرح کے اعلانات کے پس پشت متناسب قوت موجود نہ ہو تو اس سے عوام میں سلامتی کا جھوٹا احساس پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ملک کی سلامتی' مسئلہ کشمیر' نیوکلیر مسئلے اور معاشی ترقی جیسے نازک اور اہم مسائل پر قومی اتفاق رائے موجود ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اس اتفاق سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے اپنے فوری مفادات کی خاطر افتراق کا شکار ہیں۔ اسی حکومت اور حزب اختلاف کی محاذ آرائی کی وجہ سے ان اہم قومی امور پر معروف جمہوری طریقے کے مطابق کمیٹیوں کے ذریعے مناسب حکمت عملی کا تعین اور اس پر اشتراک عمل تک مفقود ہے۔

مسئلہ کشمیر

مجھے نہیں معلوم کہ ہماری کوئی طویل المیعاد کشمیر پالیسی ہے یا نہیں' اور اگر ہے تو اس کو حسب حالات تشکیل دیتے رہنے کا کیا انتظام ہے۔ کشمیر کے مسئلہ کی اہمیت متقاضی ہے کہ اس مقصد کے لیے وزیراعظم کی صدارت میں ایک خصوصی کشمیر کمیٹی قائم کی جائے' جس میں قائد حزب اختلاف کے نامزد کردہ ایک ایک ایم این اے اور سینیٹر شامل ہوں۔ یہ کمیٹی کشمیر پر قومی پالیسی بنائے' اس کے لیے حکمت عملی طے کرے اور اس کی تنفیذ کی نگرانی کرے۔ اور ان کی تجاویز کی روشنی میں جامع کشمیر پلان مرتب کر کے اس پر عمل کیا جائے۔

کشمیر کے حوالے سے چند امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ کشمیر کے سب حریت پسند بھارت کے مخالف ہو سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ سب پاکستان کے حامی ہوں۔ لبریشن فرنٹ کے نعرہ آزادی میں کشش ہے اور اس کے اثرات آزاد کشمیر میں بھی ہو سکتے ہیں۔

۲۔ آزاد کشمیر میں جمہوری عمل اعلیٰ درجے کا اور بالکل شفاف ہونا چاہیے تاکہ بھارتی کشمیر کے عوام کو اس میں کشش محسوس ہو۔ آزاد کشمیر حکومت کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش بھارت کے مقاصد پورا کرے گی اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کو پاکستان سے دور کر دے گی۔

۳۔ طاقت' شہرت اور دولت کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔ جہاد کے اختتام پر حریت پسند اپنا اختیار چھوڑنا پسند نہیں کریں گے' جیسا کہ افغانستان میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اس بارے میں ابھی سے فکر کرنا چاہیے۔

۴۔ اخلاقی اقدار اور عملی سیاست کاری کے تقاضے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے' اگر مظلومین مسلمان ہوں تو مغرب انسانی حقوق کے بارے میں بے حس ہوتا ہے۔ چنانچہ کشمیر پر دنیا کی توجہ اور ہمدردی مرکوز رکھنے کے لیے ہمیں انسانی حقوق کے علاوہ دوسرے زاویے بھی تلاش کرنا چاہییں۔

۵۔ جدوجہد آزادی کا مسلسل پیشہ ورانہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ کشمیری مجاہدین اسے کتنی مدت تک اور کس قیمت پر برقرار رکھ سکتے ہیں؟ اس کی رفتار کو دوستانہ عناصر کے تعاون سے برقرار رکھنا بے حد ضروری ہے۔ بھارت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عنقریب صورت حال کو پلٹ دے گا۔

۶۔ بھارت کو کشمیر میں لڑائی میں مشغول رکھنا' کوئی بڑی جنگ انگیخت کیے بغیر' ممکن بنانا چاہیے۔

۷۔ یہ امر تشویش ناک ہے کہ عراقی حدود میں ترکی کے اور افغانستان پر روس کے حالیہ ہوائی حملے ایک سنگین کارروائی تھے لیکن دنیا نے ان کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ دنیا کی یہ بے حسی بھارت کی

حوصلہ افزائی کر سکتی ہے کہ وہ لائن آف کنٹرول پار کر کے حملے کرے۔ اس صورت حال کے مضمرات کا جائزہ لے کر' ابھی سے متعلقہ حلقوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔

۸۔ بھارت پاکستان بالواسطہ تجارت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں بعض بڑے سیاسی نام بھی لیے جاتے ہیں۔ غیر سرکاری اعداد و شمار کی بنیاد پر بھارت کے دانش ور تجارتی پابندیاں ختم کرنے کی آواز بھی اٹھا رہے ہیں۔ ان تجارتی بے قاعدگیوں کی تفتیش ہونا چاہیے۔

پاک امریکہ تعلقات

۱۔ اگر امریکہ کے اپنے قومی مفادات معرض خطر میں آجائیں تو وہ ٹھوس اقدامات کرتا ہے۔ عدم پھیلاؤ معاہدے میں توسیع 'کویت' ہیٹی اور ایران اس کی چند مثالیں ہیں۔ اس کے برعکس بوسنیا' صومالیہ' روانڈا اور کشمیر پر وہ صرف زبانی جمع خرچ کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ اسے ایک ناقابل اعتماد غیر یقینی عالمی طاقت بناتا ہے۔

۲۔ امریکہ سے تعلقات کے بارے میں ہمیں امریکی خیرسگالی کے حصول اور قومی مفادات کے تحفظ کے درمیان نہایت احتیاط سے توازن رکھنا چاہیے۔ چند سال قبل یورینیم افزودگی کے منصوبے سے دستبرداری کی پالیسی نے امریکہ کو پاکستان پر دباؤ ڈالنے اور سزا دینے کی کارروائی پر شیر کر دیا ہے۔ اگر ہم انصاف کے اصولوں پر منطقی انداز میں اپنا کیس اچھے انداز سے پیش کریں تو شاید امریکی اسے بہتر سمجھ سکیں گے۔ وہ ہماری کمزوری کو لازماً ہمارے خلاف استعمال کریں گے۔

۳۔ ہمیں امریکہ سے اپنے تعلقات معمول پر ضرور لانا چاہییں مگر اپنے اصولوں پر سمجھوتہ کیے بغیر۔ وزیراعظم کے دورہ امریکہ سے قبل کے ان کے فیصلوں کی صدر کلنٹن نے جس گرم جوشی سے تعریف کی اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ فیصلے واشنگٹن کی خاطر کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے دورہ کے بعد کی صورت حال یہ ہے کہ پریسلر ترمیم قائم ہے' اور مجوزہ تبدیلیاں نمائشی ہیں۔ ایف ۔۱۶ طیاروں کے بارے میں ہم خواہ مخواہ ہی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے حالانکہ ہمیں اپنی رقم کے ساتھ سود اور ہرجانہ بھی طلب کرنا چاہیے۔ ہمارے اسلحے کی مرمت پر زیادہ رقم طلب کی جا رہی ہے۔ جہاں تک ہمارے فوجی افسران کو تربیت کی سہولت کا تعلق ہے' تو یہ دراصل امریکہ کے اپنے طویل المیعاد مفادات کا حصہ ہے۔

۴۔ ہم سے اندرونی معاملات میں حماقتیں سرزد ہوئی ہیں لیکن خارجہ پالیسی کے باب میں ہمارے بڑے بڑے فیصلے بالعموم درست ثابت ہوئے ہیں۔ چین سے ہمارے تعلقات' ماضی میں امریکہ سے تعلقات' جہاد افغانستان کی حمایت' اور نیوکلیر پالیسی' اس کی کچھ مثالیں ہیں۔ اب لگتا ہے کہ

خارجہ امور پر ہماری گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے۔ آئی ایم ایف کے نگران اسلام آباد میں مستقل قیام کر کے ہمارے بجٹ اور مالی پالیسیوں کو طے کرتے ہیں۔

۵۔ کیا ہمیں اسلام کی تعبیر کے لیے کسی ویٹیکن کی مدد کی ضرورت ہے؟ امریکہ اور اس کے اتحادی ہمیں مذہبی انتہاپسندی کے خلاف وعظ کہنے کا حق نہیں رکھتے۔ وہ خود یورپ ' امریکہ ' اسرائیل اور آسٹریلیا میں نسلی صفائی کے مرتکب ہیں۔ جو ہم پر اسلامی بنیاد پرستی کا الزام لگاتے ہیں' ہمیں ان مسلمانوں کے نام بتائیں جنھوں نے نسلی امتیازی پالیسی اختیار کی ہو یا ریڈ انڈین اور قدیم باشندوں کا خاتمہ کیا ہو۔

۶۔ اقوام متحدہ کے امن دستوں میں پاکستان کی شمولیت پر امریکہ خوش ہوتا ہے لیکن جو ملک دستے فراہم کر رہے ہیں ان کو اقوام متحدہ کے فیصلوں کی تنفیذ کے بارے میں پالیسی فیصلے کرنے کا اختیار ملنا چاہیے۔ بوسنیا میں اختیار اور فیصلے کا پورا انتظام برطانوی اور فرانسیسی افسران کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نو استعماریت ہے۔

۷۔ عراق جنگ کے بعد خلیجی ممالک سے ہمارے تعلقات سرد مہری کا شکار ہیں۔ آخر ان ممالک میں منشیات کی تجارت کے الزام میں کتنے پاکستانیوں کے سر قلم ہونے کے بعد ہم اپنے ملک کے بڑے منشیات فروشوں پر ہاتھ ڈالیں گے؟ امریکہ نے ہمارے کئی معروف بڑوں پر کھلے عام الزام لگایا ہے۔

۸۔ باہمی صحت مند تعلقات ' امریکہ اور پاکستان دونوں کے مفاد میں ہیں۔ دونوں ممالک سفارتی تعلقات کو درست کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں دوسرے متبادل بھی تلاش کرنا چاہییں اور خارجہ پالیسی کو کثیر الجہت بنانا چاہیے۔ پاکستان اور روس کے تعلقات کی سطح کا مستقل نیچے رہنا ہماری سیاست کاری کے لیے کوئی قابل تعریف بات نہیں۔ یہ بات کہ ہماری وزیر اعظم اب تک اس کا دورہ نہیں کر سکی ہیں' اس امر کا غماز ہے کہ ہم روس کو صحیح مقام نہیں دے رہے ہے۔ چین ' سعودی عرب اور مصر کے ساتھ ہمارے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔

۹۔ وسط ایشیائی ممالک کے ساتھ بھارتی سرمایہ کاروں نے تجارتی تعلقات وسیع کر لیے ہیں جب کہ ہماری کارگزاری لفاظی تک ہے۔ ایکو (ECO) افغانستان میں امن کے قیام تک موثر نہیں ہو سکتی۔ ہم اس ہمسائے کے معاملے میں بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں' اور تجارت کی آمد ورفت ' سمگلنگ اور راہ داری کی سہولت کے مسئلوں پر اسے تنگ کر رہے ہیں۔ ان امور کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ امور جلدی میں طے نہیں ہو سکتے۔ افغانستان ہمارا قریبی اور اہم پڑوسی ہے اور اس میں امن اور استحکام ہماری ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے ساتھ ہمارے تعلقات کی سطح کا گراف نیچے جا

رہا ہے۔اب ہمیں وہاں امن کے پیامبر کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جاتا۔ہمیں اس پر تشویش ہوتی چاہیے۔

۳۔ عبدالستار

سابق وزیر خارجہ پاکستان

خارجہ پالیسی کے سلسلے میں کئی ممالک کے ساتھ تعلقات پر بحث ضروری ہے' خصوصاً چین' جاپان' یورپ' جرمنی' روس اور خلیجی ممالک کے ساتھ۔اور بھارت تو ہے ہی ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ۔لیکن فی الحال میرا موضوع صرف پاک امریکہ تعلقات ہیں۔

پاکستان پر امریکہ کو نظرانداز کرنے کا الزام تو کسی طرح نہیں لگایا جاسکتا: ہمارے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا تب بھی ہم نے امریکہ کو خوش کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔اسلحے کی فروخت اور اقتصادی امداد کی بندش کو بھی ہم نے خوشی خوشی برداشت کیا۔ہمارے جیسے غریب ملک کے ایک ارب ۴۰ کروڑ ڈالر کی پیشگی ادائگی کے باوجود ایف-۱۶ طیاروں کو روکے رکھنے سے بھی ہمارے جوش و جذبہ میں کمی نہ آئی۔

نسبتاً زیادہ باوقار پالیسی اختیار کرنے کی تجویز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم دوسری انتہا کی طرف چلے جائیں۔ہماری حکومتوں نے مقابلے پر آکر ٹکر لینے سے احتراز کیا ہے' اور ٹھیک ہی کیا ہے۔ہمیں اس حقیقت کا احساس ہے کہ امریکہ نے جتنا نقصان ہمیں پہنچایا ہے' اس سے زیادہ پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔اس کے باوجود' ہماری حکومتیں امریکہ کو جتنی اہمیت دیتی ہیں اس پر تعجب ہوتا ہے۔امریکہ ہمیں کوئی امداد نہیں دیتا' ہم سے غیرمنصفانہ سلوک کرتا ہے' لیکن ہمارے سیاسی راہ نماؤں پر خوب اثر و رسوخ رکھتا ہے۔غالباً وہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ ہی ملک میں ان کی حکومت قائم رکھ سکتا ہے' یا اسے گرا سکتا ہے۔

ہم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ امریکہ کی بدلتی پالیسی اس کی سلامتی اور معیشت کے بدلتے مفادات کی آئینہ دار ہے۔۷۰ کے عشرے کے وسط سے پاکستان کو ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے سے روکنا اس کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔افغانستان پر روسی حملے کی مزاحمت کے صلے میں ہمیں کچھ انعام دیا گیا' لیکن اس کے بعد سے ایٹمی پروگرام ہی کی وجہ سے ہم مسلسل بدترین دباؤ کا شکار ہیں۔اس میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ واشنگٹن یا اسلام آباد میں کون حکومت کر رہا ہے۔ایسا کیوں ہے؟ اگر ہم اس کی صحیح وجہ تلاش کر سکیں تو ہم خطرات سے بچاؤ اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب تدابیر اختیار کر سکتے ہیں تاکہ مستقبل میں ناکامیوں سے بچ سکیں۔

امریکی پالیسی میں تبدیلی

یکم فروری ۱۹۹۵ کو امریکہ کے وزیر دفاع ولیم پیری نے نیویارک میں تقریر کرتے ہوئے پریسلر ترمیم کو ایک کند ہتھیار قرار دیا' جو نہ صرف غیر موثر ہے بلکہ الٹے نتائج دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کلنٹن انتظامیہ نے اس ترمیم کے خلاف رائے بنانا شروع کر دی۔ وزیر توانائی ہیزل اولیری اور وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کے اعلیٰ افسران' جوزف نائی اور رابن رافیل نے کانگریس کے سامنے یہ تسلیم کیا کہ یہ ترمیم صرف پاکستان کو نشانہ بناتی ہے اور امتیازی ہے۔ ولیم پیری نے یہ بھی کہا کہ پاکستان اس علاقے میں امن کے لیے کلید ہے' کہ پریسلر ترمیم سے صرف پاکستان ہی کو نقصان پہنچا ہے' بلکہ علاقے میں امریکہ کے تجارتی اور استریٹیجک مفادات کے لیے بھی مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔

درحقیقت ہمارے وزیراعظم کے امریکہ پہنچنے سے مہینوں پہلے اس ترمیم پر نظرثانی کے عمل کا آغاز ہو چکا تھا' یہ کہنے کا مطلب وزیراعظم کے دورہ کی اہمیت کو کم کرنا نہیں۔ انھوں نے نہایت لیاقت سے پاکستان کا کیس پیش کیا اور حمایت حاصل کی۔ لیکن فی الحال پاکستان کے لیے ابھی صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ ہم صرف یہ امید اور خواہش کر سکتے ہیں کہ صدر کلنٹن اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں اور ہم کو اپنی خریدی ہوئی چیزیں مل جائیں' یا قیمت واپس مل جائے۔ لیکن ہمیں یہ ضرور غور کرنا چاہیے کہ امریکہ میں پریسلر ترمیم پر نظرثانی کی ضرورت کا احساس کیوں پیدا ہوا؟ شاید ہم امریکی ذہن کو مکمل طور پر نہ پڑھ سکیں' لیکن ہم یہ ضرور دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان نے بھی رعایتیں دی ہیں اور ان کی کیا قیمت ادا کی ہے۔

نیوکلیر مسئلے پر پسپائی کی قیمت

ایک جواب تو ولیم پیری کی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ پاکستان اپنا نیوکلیر پروگرام ترک کرنے پر راضی نہیں کیا جا سکا ہے۔ یعنی امریکی پالیسی میں تبدیلی انصاف اور قانون کی بنیاد پر نہیں' اس ترمیم کی ناکامی کی وجہ سے ہے۔ اس کا کریڈٹ ہمیں اپنے عوام کو دینا چاہیے جو ملک کی سلامتی کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں' اور خود امریکی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کے عوام نیوکلیر ترقی کو ملک کی سلامتی کے لیے فیصلہ کن سمجھتے ہیں۔ لیکن پاکستان نے ۱۹۸۹ میں افزودہ یورینیم کی پیداوار بند کر کے جو رعایت دی ہے' ہمیں اس کی سنگینی کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم نے یک طرفہ اقدامات کی مخالفت کے اپنے دیرینہ اصول کو ترک کر دیا۔ گذشتہ ۶ سال سے یہ تعطل برقرار ہے حالانکہ اس سے پاکستان کی طویل المیعاد سلامتی کو خطرہ لاحق ہے۔ شاید واشنگٹن کیپ کرنے کے فیصلے پر عوامی ردعمل سے آگاہ

ہے۔ اس لیے اس نے تعریفی الفاظ اور ظاہری طور پر نرم موقف اختیار کر کے اسلام آباد کو نوازنا ضروری سمجھا۔

امریکہ کو مداخلت کی اجازت

حکومت نے امریکی پولیس کو پاکستان کی حدود میں کام کرنے کی اجازت دے کر' اور ملکی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر امریکہ کو مطلوب افراد اس کے حوالے کر کے واشنگٹن کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ اپنے قوانین کو نظرانداز کر کے اور ریاست کی خودمختاری پر سمجھوتہ کر کے ہم نے کیا کھو دیا ہے۔ ہماری حکومت نے جو کچھ کیا ہے اس سے خلافت عثمانیہ کے زوال کے دور میں یورپی طاقتوں کے آگے اس کی سپراندازی کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔

اسلامی بنیاد پرستی کے خلاف فرنٹ لائن

بے نظیر کلنٹن مشترکہ اعلامیے میں پاکستان کو اسلامی دنیا میں معتدل رویے کو آگے بڑھانے میں کلیدی کردار تفویض کیا جانا بھی کم تعجب خیز نہیں۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ معتدل رویے کا لفظ انتہا پسندی کے برخلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ امریکہ نے کمیونزم کی جگہ ایک نیا خطرہ اسلامی بنیاد پرستی اور انتہا پسندی کا ایجاد کر لیا ہے۔ یہ بالکل نظرانداز کر دیا کہ امریکہ میں بھی انتہا پسند ہیں (مثال: اوکلاہوما) 'یہودیت' عیسائیت اور ہندومت میں بھی بنیاد پرستی کی تحریکیں ہیں۔ پھر آخر پاکستان صرف اسلامی دنیا میں اعتدال کی ضرورت کے حق میں بیان پر کیوں راضی ہوا؟

یہ خوب ستم ظریفی ہے کہ ہماری اسلامی جمہوریہ کی حکومت جو دستور کا پابند ہے کہ "وہ مسلم ممالک میں اسلامی اتحاد کی خاطر باہمی تعلقات کو قائم اور مضبوط کرے" وہ نام نہاد اعتدال پسندی کے لیے فرنٹ لائن بننے کے لیے اتنی زیادہ بے چین ہے۔ صرف مسلم دنیا کے خلاف یہ مہم چلانے والوں کے ساتھ شامل ہو کر پاکستان اسلام دشمن طاقتوں کے ہاتھ میں کھیلے گا۔ ان اسلام دشمن طاقتوں کے ہدف پر ایران' لبنان کی حزب اللہ' فلسطین کی حماس اور مصر کی اخوان المسلمین اور الجزائر کا اسلامک فرنٹ ہیں۔ اگر ہم مسلم عوام کی امنگوں اور آرزوؤں سے بے نیاز ہو جائیں تو پاکستان کی روح کو چین نہیں آئے گا۔ یہ کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کو بھی نقصان پہنچانے کا باعث ہو گا جسے بھارتی اور بعض غیر ملکی میڈیا مسلم انتہاپسندی کا نام دیتے ہیں۔

ایران دشمنی میں ہم نوائی سے اجتناب

پاکستان کو اپنا دامن اس سے بالکل پاک رکھنا چاہیے کہ وہ امریکہ کی ایران دشمن مہم میں کسی

طرح بھی ملوث ہو' یا ملوث ہونے کا تاثر پیدا ہونے دے - امریکی سینیٹ کی ایک کمیٹی میں پاکستان اور ایران کے غیر صحت مند روابط کی حوصلہ شکنی کی ضرورت کا اظہار کیا گیا لیکن ہمیں اپنے مفادات کا خود شعور ہونا چاہیے - پاکستان ایران سے اپنے دوستانہ تعلقات پر کسی سمجھوتہ یا اس برادر پڑوسی کو تنہا کرنے کی کسی حکمت عملی میں شرکت کا متحمل نہیں ہو سکتا - یقیناً پاکستان امریکی پالیسیوں پر اثرانداز ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے' اور نہ وہ ان کی مذمت کرنے کی قیمت ادا کر سکتا ہے' لیکن ایران کے ساتھ اقتصادی تعاون بڑھا کر اس کے ساتھ اپنی یک جہتی کا اظہار کر سکتے ہیں اور ہمیں یہ ضرور کرنا چاہیے -

وزیر اعظم کا دورہ امریکہ

ہماری وزیر اعظم کے دورہ امریکہ میں ہمارے ملک کی تاریخ میں پاکستان کے کسی سربراہ کے دورہ سے بھی زیادہ پیسہ بہایا گیا ہے - ۷۰ کے عشرے سے بڑے بڑے قافلے ساتھ جانے کی روایت پڑی ہے لیکن اس سے قبل کبھی بھی حکومت پاکستان اور پبلک سیکٹر کارپوریشنز نے واشنگٹن پوسٹ میں ۲۲ صفحات' اور اسی طرح نیویارک ٹائمز میں کروڑوں روپے صرف کر کے اشتہارات نہیں دیے -

تصادم اور سپر اندازی کے درمیان توازن

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات پر غیر یقینی کے سائے ہیں - ہمارے ایف -۱۶ جہازوں کے لیے پریسلر ترمیم پر نظر ثانی کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا - اگر یہ ہو جائے تو تعلقات کے ایک تکلیف دہ باب کا اختتام ہو گا - لیکن جب تک پریسلر ترمیم بطور قانون موجود ہے' تعلقات معمول پر نہیں آ سکتے -

پریسلر ترمیم رہے یا نہ رہے' پاکستان کو ایسی پالیسی اختیار کرنا چاہیے جو تصادم اور سپر اندازی دونوں سے بچ کر رہے - ہم امریکی امداد کے بدلے میں اپنی ایٹمی صلاحیت کا سودا نہیں چکا سکتے' کما حقہ صلاحیت کے حصول کے لیے یورینیم افزودگی کی مطلوبہ سطح حاصل کرنے کے لیے ہماری حکومت کو امریکہ کی ناراضی کے ڈر سے ہچکچانا نہیں چاہیے' ایران کے ساتھ یک جہتی کے اظہار کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنا چاہیے - پاکستان کو عالمی سطح پر اعتدال پسندی کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے' لیکن بحیثیت اسلامی جمہوریہ اس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ یہودیوں کے پھیلائے ہوئے اس مغربی پروپیگنڈے کی مخالفت کرے جو نام نہاد اسلامی بنیاد پرستی کو نئے دشمن کے طور پر پیش کر رہا ہے -

۴ - فرحت اللہ بابر

نیوکلیر پروگرام اور توانائی

ہماری خارجہ پالیسی کی تشکیل میں ہمارے نیوکلیر پروگرام کا کردار مرکزی حیثیت اختیار کر چکا

ہے۔ دوسری طرف بھارت نیوکلیر پروگرام کے گہرے اثرات ہماری توانائی کی صورت حال پر پڑ رہے ہیں' جس کے ساتھ سلامتی' استحکام اور خارجہ پالیسی کا راست تعلق ہے۔ اس لیے نیوکلیر پروگرام کے مسئلے پر توانائی کے پہلو سے غور کرنا ضروری ہے۔

توانائی کے لحاظ سے پاکستان دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ہے۔ ہمارے ہاں اس کا استعمال دنیا کی اوسط کا ۱/۷' ترقی یافتہ ممالک کا ۱/۲۰ اور امریکہ کا ۱/۳۰ ہے۔ نیوکلیر توانائی کے مسئلے کا مطالعہ اس پس منظر میں کرنا چاہیے۔ ہماری توانائی کی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ پٹرول پر دباؤ کم کر کے اسے صرف ٹرانسپورٹ تک محدود کر دیں' اور بجلی پیدا کرنے کے لیے گیس کا استعمال کم سے کم کریں۔ کیونکہ پانی کے ذریعے بھی ہماری بجلی کی ضروریات پوری نہیں ہو سکیں' اس لیے ہمیں تقریباً ۱۰ ہزار میگاواٹ کی کمی پوری کرنے کے لیے نیوکلیر توانائی پر انحصار کرنا ہو گا۔ لیکن یہ اتنا سادہ معاملہ نہیں۔ اس کا حصول بھارت اور پاکستان دونوں کے نیوکلیر پروگرام اور خارجہ پالیسی کے لیے مضمرات سے متعلق ہے۔

۱۹۷۴ میں بھارت کے ایٹمی دھماکے کے بعد پاکستان نے ری پروسسنگ اور یورینیم افزودگی کی حساس ٹیکنالوجی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان اقدامات کا براہ راست تعلق توانائی سے نہ تھا' لیکن اس سے پاکستان کے نیوکلیر پروگرام کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی' فرانس اور کینیڈا سے کئی معاہدات منسوخ کیے گئے' یا ان پر عمل نہ کیا گیا۔ حد یہ ہے کہ کینیڈا نے کراچی کے نیوکلیر پاور پلانٹ (KANUPP) کے لیے فاضل پرزے' ایندھن اور دیگر ضروریات کی فراہمی پر پابندی لگا دی۔ اس طرح امریکہ نے ۱۹۷۶ میں سمنگٹن (Symington) لا کے ذریعے ہماری امداد کا سلسلہ بند کروا دیا۔ اس صورت حال نے پاکستان کے توانائی کے منصوبوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا کیں۔

عدم پھیلاو کے بارے میں ہمارا موقف

پاکستان کا موقف ہے کہ وہ عدم پھیلاؤ پر یقین رکھتا ہے۔ این پی ٹی (NPT) پر ہمارے اعتراضات اخلاقی نہیں ہیں اور اگر بھارت دستخط کر دے تو ہم بھی دستخط کرنے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف بھارت کا موقف ہے کہ عدم پھیلاؤ معاہدہ ترقی پذیر ممالک کی سلامتی کے مسئلے کو نظرانداز کرتا ہے' اور اس کی بنیاد اس پر ہے کہ گورے نیوکلیر ٹیکنالوجی زیادہ ذمہ داری سے استعمال کریں گے۔ اس معاہدہ کے پردہ میں' ترقی یافتہ ممالک اپنے مستقل سیاسی اور معاشی غلبے کا راستہ ہموار کر رہے ہیں' اس لیے بھارت اس معاہدے پر دستخط نہیں کرے گا۔

اگر ہم ایٹم بم بنانے کی پالیسی اختیار کریں تو ہماری خارجہ پالیسی پر کیا دباؤ ہوں گے:

۱- ۱۹۹۰ کے بعد سے امریکہ کی ہر طرح کی فوجی اور اقتصادی امداد بند ہے۔

۲- چین 'جنوبی افریقہ اور فرانس کی جانب سے معاہدے پر دستخط کی رضامندی نے ہمارے اوپر دباؤ بہت بڑھایا ہے۔

۳- امریکہ 'روس اور مغربی یورپ کے ممالک تخفیف اسلحے کے مختلف معاہدات کے تحت ایٹمی اسلحے کے ذخائر کم کر رہے ہیں۔ اس سے دستخط نہ کرنے والوں کا ایک بڑا اعتراض ختم ہو گیا ہے۔

اس پس منظر میں امریکہ نے بھارت اور پاکستان پر اپنا دباؤ بہت بڑھا دیا ہے۔ ۱۹۹۲ میں امریکہ کی وزارت دفاع نے ایک ۴۶ صفحے کی دستاویز ایک اخبار کو افشا کی جس میں روس کے زوال کے بعد کی پالیسی بیان کی گئی تھی۔ اس دستاویز میں کہا گیا تھا کہ:

"امریکہ کو اس مسئلے سے سابقہ پیش آسکتا ہے کہ آیا وہ بڑے پیمانے پر تباہی کے اسلحہ جات کی تیاری اور استعمال روکنے کے لیے فوجی اقدامات کرے یا نہیں"۔ وسط ایشیا کی ریاستوں: قازقستان' یوکرائن اور سلورشیا نے ایٹمی اسلحے روس کے حوالے کر دیے ہیں 'مشرقی یورپ کے ممالک پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔ اگر امریکہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہوتا تو دنیا میں ایٹمی طاقتیں دگنی ہو جاتیں اور کئی دوسرے ممالک بھی تیاری کر رہے ہوتے۔

ہماری خارجہ پالیسی کے لیے ایٹمی اسلحے کی تیاری کے کیا مضمرات ہیں؟ ایک مختصر جائزہ:

۱- ایٹمی اسلحے کا حصول پڑوسی ممالک کو متوحش کر دے گا اور اسے بے اثر بنانے کے لیے ابتدائی سطح پر 'یا کسی بحران کے موقع پر روایتی یا ایٹمی حملہ کیا جا سکتا ہے۔

۲- اس کے اثرات معکوس ہو سکتے ہیں۔ روایتی دفاع کی صلاحیت اس لیے متاثر ہو گی کہ وسائل فراہم نہ ہوں گے اور باہر سے فوجی اسلحہ نہیں ملے گا۔ اس کی ایک واضح مثال ایف-۱۶ طیاروں کی فراہمی میں طویل تعطل ہے۔ اگر پابندی نہ لگائی جاتی (جو ایٹمی پروگرام کی وجہ سے لگائی گئی ہے) تو ۱۹۹۲ تک پاکستان کو ۱۰۰ 'ایف-۱۶ طیارے مل چکے ہوتے۔

۳- جب تک ہم خود انحصاری کی منزل حاصل نہ کرلیں 'روایتی دفاعی صلاحیت برقرار رکھنے کے لیے امریکہ پر ہمارا انحصار فیصلہ کن ہے۔ حب وطن کے جوش میں ہمیں اس کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔

۴- ہمارے نہایت ضروری ترقیاتی پروگراموں کے لیے اقتصادی امداد خطرے میں پڑ جائے گی۔ امریکہ خواہ خود زیادہ امداد نہ دے لیکن معطی ایجنسیز اور یورپی اور دیگر ممالک میں اپنا اثر و رسوخ

استعمال کر سکتا ہے۔

۵۔ اگر ہم ایٹم بم بنائیں گے ' تو یقیناً بھارت بھی بنائے گا۔ اس سے عدم استحکام پیدا ہو گا بلکہ ہماری سلامتی مزید کمزور ہو گی۔ اس لیے کہ بھارت کو دیگر کئی لحاظ سے پاکستان پر برتری حاصل ہے۔ یقیناً بھارت کے پاس زیادہ ایٹمی امکانات ہوں گے۔ اس لیے ہم اپنی ایٹمی صلاحیت سے دشمن کو باز رکھنے کی صلاحیت کے بارے میں ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا رہیں گے۔ ہم خود کار زینہ پر قدم رکھ دیں گے۔ کیا ہم اس کی اقتصادی قیمت ادا کر سکیں گے ' اقتصادی بدحالی سیاسی بے چینی کو جنم دیتی ہے۔ روس اس کی مثال ہے کہ قوت و سلامتی کی بے جا فکر نے اس کی معیشت کو برباد کیا اور ملک ٹوٹ پھوٹ گیا۔

بم بنانا ایک علیحدہ قدم نہیں ہے۔ یہ ایک آغاز ہے۔ جس میں آگے ہی آگے بڑھنا ہو گا۔ اگر دوسرا فریق بم گرانے کی تکنیک میں چند سیکنڈ کی برتری حاصل کر لیتا ہے تو ہماری باز رکھنے کی ساری حکمت عملی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ ہم سلامتی کی تلاش میں ' دہشت کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔

جب ہم اقتصادی قیمت کی بات کرتے ہیں تو صرف بم بنانے ' اسے گرانے اور اسے برابر بہتر بنا لینے سے مطلب نہیں ہوتا۔ ذرا یہ بھی سوچیں کہ ہم ترقی کے لیے کس کس ٹیکنالوجی سے ' توانائی کی ضروریات کے لیے کتنے پاور پلانٹس سے محروم رہیں گے اور سفارتی تنہائی اور (جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ۱۹۷۷ء میں عدم استحکام) کی صورت میں کیا کیا قیمت ادا کریں گے۔ گذشتہ ۲۰ برس سے ہم اپنی قومی گرہ میں ایٹمی اسلحے کے پروگرام کی وجہ سے جس نے ہمیں سفارتی تنہائی کا شکار کر رکھا ہے ' ایٹمی توانائی کا ایک میگاواٹ بھی اضافہ نہیں کر سکے ہیں۔

ایٹم بم بنانے کی پالیسی سے ہمارے تعلقات صرف امریکہ اور روس سے ہی نہیں بلکہ جاپان اور یورپ کے ترقی یافتہ ممالک سے بھی خراب ہو جائیں گے۔ اس طرح کے منفی نتائج کے پیش نظر جرمنی ' جاپان ' کوریا ' تائیوان ' ترکی ' سویڈن اور اب مصر اور سعودی عرب جیسے ممالک نے جو اسلحے بنانے کے وسائل رکھتے تھے ' اسے ترک کر کے NPT پر دستخط کر دیے ہیں۔ سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں ۵۰ اور ۶۰ کے عشرے میں ایٹمی اسلحے کی حمایت اور مخالفت میں بڑی بحث ہوئی۔ یہ جنوبی کوریا میں بھی ہوئی۔ مختلف سیاسی اور اسٹریٹیجک صورت حال کے باوجود سب نے ایک ہی فیصلہ کیا۔ سویڈن نے تو بم بنانا شروع کر دیا تھا لیکن پھر مزید غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ اس کی سلامتی کے مفادات بم کے بغیر بہتر طور پر پورے ہوں گے۔ (اخذ و ترجمہ : مسلم سجاد)

تفسیر فی ظلال القرآن

سید قطب شہید ؒ

ترجمہ

سید معروف شاہ شیرازی

جلد اول (پارہ 1 - تا - 4)

☆ سائز :	23 x 33/8	☆ کاغذ :	فلائنگ 55 گرام
☆ صفحات :	962	ہدیہ :	250 روپے

ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

اخبارِ امت

مصراور سوڈان: آمنے سامنے

عبد الغفار عزیز

ایتھوپیا کے دار الخلافہ ادیس ابابا میں ۲۶ جون ۹۵ کو تنظیم وحدت افریقہ کے سربراہی اجلاس میں آمد کے موقع پر مصر کے صدر حسنی مبارک پر ناکام قاتلانہ حملہ ہوا۔اس کے نتیجے میں مصراور سوڈان کی فوجیں دوبارہ آمنے سامنے آگئی ہیں۔مصراور سوڈان کی کشمکش تو قدیم اور تاریخی ہے لیکن سوڈان شریعت اسلامی کے نفاذ کے بعد جس طرح مغرب کی آنکھوں میں کھٹک رہا ہے' اسی طرح مغرب کے تابعدار اور مغرب کی مدد سے اپنے ملکوں کے عوام کی گردنوں پر مسلط ظالم و جابر حکمران بھی اسے نیست و نابود کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔حسنی مبارک حملے کے بعد کانفرنس میں جانے کے بجائے براہ راست ایرپورٹ سے قاہرہ پہنچے اور بغیر تحقیق سوڈان پر اس حملے کا الزام رکھ دیا۔اسرائیلی وزیر اعظم اسحاق رابین کو اس میں فوراً ہی ایران کا ہاتھ نظر آگیا۔حملے کے چند روز بعد ایتھوپیا کے تحقیقاتی ادارے کی رپورٹ سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ موقعے پر ہلاک ہونے اور زخمی ہو کر ہسپتال میں ہلاک ہونے والے پانچوں حملہ آور مصری تھے۔

مسلح جدوجہد پر یقین رکھنے والی مصری کی ایک پارٹی "الجماعة الاسلامية" نے خبر رساں ایجنسی رائٹر کے ذریعے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کہا کہ "ہم اس وقت تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے جب تک ہم مصری سرزمین کو جھوٹے خداؤں سے پاک نہیں کر دیتے"۔

ان تحقیقاتی رپورٹوں اور اعترافات کے بعد مصراور سوڈان کے درمیان تناؤ ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن مصر کو تو بہانے کی تلاش تھی۔چنانچہ اسی رات ۸ بجے شب اس کی فوجوں نے سرحدی علاقے "حلایب" کی مثلث میں (جس پر مصر نے اپنے ملکیتی دعووں کے پس منظر میں ۱۹۹۲ میں بھی حملہ کیا تھا) "ابو رماد" چوکی پر حملہ کرتے ہوئے ایک پولیس افسر اور ایک سپاہی کو ہلاک اور سات کو شدید

زخمی کر دیا۔ ابورمادے سے آگے بڑھتے ہوئے مصری فوجوں نے دو مزید چوکیوں پر بھی حملے کیا اور وہاں موجود سپاہیوں سے اسلحہ چھین لیا۔ اس اشتعال انگیزی کے باوجود سوڈان نے حلایب کی پٹی میں اپنی فوجیں جمع نہیں کیں، اور سوڈان میں موجود سلامتی کونسل کے مستقل رکن ممالک کے سفراء سے مصر کو باز رکھنے کی اپیل کی۔ لیکن مصر کے حکمرانوں کی طرف سے یہ دھمکیاں دی جاتی رہیں کہ "ہم چاہیں تو دس دن کے اندر اندر خرطوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں"۔ "خرطوم کے لیے تو ہمارے دو چار جنگی جہاز ہی کافی ہیں...." وغیرہ وغیرہ۔

اس قاتلانہ حملے سے ایک ہفتہ قبل ادیس ابابا میں ایک اور اہم کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کی صدارت اریٹریا کے صیہونیت نواز عیسائی صدر اسیاس افورقی نے کی تھی اور اس میں جنوبی سوڈان میں علیحدگی کی جنگ کے قائد جون قرنق سمیت وہ تمام سابقہ حکمران پارٹیاں شریک ہوئیں جو اپنے اپنے دور میں جون قرنق کے ساتھ برسرپیکار رہ چکی ہیں۔ اس کانفرنس میں امریکہ، اسرائیل اور مصر کے سفرا بھی مبصر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ کانفرنس کے تمام شرکا نے اس مشترکہ پالیسی کا اعلان کیا کہ "سوڈان کی موجودہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہم ہر ممکنہ جدوجہد کریں گے"۔ اس کانفرنس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ سوڈان کو ایک سے زیادہ محاذوں پر اپنی قوت تقسیم کرنے پر مجبور کیا جائے (کیونکہ سوڈان نے صرف جنوب پر اپنی توجہ مرکوز کر کے علیحدگی پسندوں کا مسئلہ ۹۰ فی صد حل کر لیا ہے)۔ صدر حسنی پر حملے کے فوراً بعد حلایب میں فوجی کارروائیاں اریٹریا کانفرنس میں طے شدہ ایجنڈے کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔

۳۰ جون کو سوڈانی اسلامی انقلاب کی چھٹی سالگرہ تھی۔ اس موقع پر صدر عمر حسن البشیر نے خرطوم کے وسیع و عریض "میدان سبز" میں ایک عظیم الشان عوامی ریلی سے خطاب کیا۔ اس ریلی میں سوڈانی "عوامی فوج" کے چالیس ہزار مسلح دستوں نے پریڈ کر کے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا اور مصر کو خبردار کیا کہ وہ سوڈان کے خلاف اپنے جارحانہ اقدامات ختم کر دے۔

سوڈانی صدر نے اس موقع پر "اسلامی انقلاب نجات" کے چھ سالہ دور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا: ہم نے ترقی، عدل اور مکمل شریعت کی طرف اپنے قدم آگے بڑھائے ہیں۔ پوری دنیا کی مخالفت، دشمنی اور اسلامی اصلاحات سے باز رکھنے کے دباؤ کے باوجود ہم نے اپنی غذائی اور زرعی پیداوار میں نہ صرف خودکفالت حاصل کی ہے بلکہ ہم اب برآمد کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں (ہماری پیداوار کا تناسبی ریٹ اس وقت ۱۳ فی صد ہے جو کسی بھی ترقی پذیر ملک کے گروتھ ریٹ سے زیادہ ہے) ہم نے صحت اور تعلیم میں خصوصی پیش رفت کی ہے اور پورے سوڈان میں یونیورسٹیوں کا ایک جال بچھا دیا

ہے۔ پٹرول اور سونا تلاش کرنے کے ضمن میں بہت سا کام مکمل ہو چکا ہے اور ابتدائی اندازے کے مطابق ہم "آریاب" نامی سونے کی کان سے عنقریب سونا نکالنا شروع کر دیں گے اور ہمیں وہاں سے سالانہ تین ٹن سونا دستیاب ہو سکے گا۔ "حماوب" ڈیم کی تعمیر اور کنانہ' رھد نامی نئی نہروں کی کھدائی جاری ہے۔ یہ منصوبہ مکمل ہونے پر ہمارا زرعی رقبہ مزید بڑھ جائے گا۔ اس وقت بھی ہم اس رقبے کو اٹھارہ ملین ایکڑ سے بڑھا کر اڑتالیس ملین ایکڑ تک پہنچا چکے ہیں۔

انھوں نے سوڈانی عوام سے کہا کہ ترقی اور کامیابی کا یہ سفر جاری رکھیں، مصر یا کسی تیسرے ملک کی دھمکیوں پہ زیادہ کان نہ دھریں۔ ہم ان کے ساتھ اچھے تعلقات کے خواہاں ہیں لیکن اگر کوئی سوڈان کی سلامتی کے لیے خطرہ بنا تو ہم اپنا دفاع کرنا بخوبی جانتے ہیں۔

مصر کے حالات پر نظر رکھنے والوں کو اس پر کوئی تعجب نہیں کہ مصری صدر پر یہ حملہ سراسر مصر کے اپنے حالات کا پیدا کردہ ہے۔ جس ملک میں مصر جیسا ظلم و جبر کا نظام نافذ ہو، جہاں نیک سیرت اور فرشتہ خصلت افراد چھانٹ چھانٹ کر تہ تیغ کیے جا رہے ہیں، وہاں کے صدر کو تو ہر وقت ایسے حملوں کی توقع کرنا ہی چاہیے۔ ان کے پیش رو تو اس مہارت کا اظہار بھی کر چکے ہیں کہ خود حملے کروا کے مخالفین کو الزام دے کر، ان کا صفایا کروائیں۔ اب بھی جیسے جیسے تحقیقات آگے بڑھ رہی ہیں یہ شک قوی ہوتا جا رہا ہے کہ مصری صدر پر یہ حملہ محض ایک ڈھونگ تھا ورنہ آخر کیا وجہ تھی کہ حملہ آوروں کی گاڑی سے برآمد ہونے والے اسلحے میں آر۔پی۔جی راکٹ لانچر سمیت بہت سے دوسرے موثر ہتھیار بھی موجود ہوں لیکن وہ ایک بلٹ پروف گاڑی پر صرف ہلکی کلاشنکوف سے حملہ کریں۔ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک طرف تو اتنی احتیاط کہ مصری صدر کی بلٹ پروف گاڑی ان کے ساتھ ہی مصر سے آئے لیکن دوسری طرف اتنی بے احتیاطی کہ صدر کے ساتھ آنے والے سارے حفاظتی عملے کو ایک ہی گاڑی میں ٹھونس دیا جائے، انھیں گاڑی کی پیشگی حفاظت کا کوئی موقع نہ دیا جائے اور وہ اس صورت حال کو قبول کرتے ہوئے اسی حالت میں ساتھ چلتے رہیں حالانکہ معمولی سیکیورٹی رسک کی صورت میں بھی ایسے سفر روک دیے جاتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ادھر حملہ ہوا اور ادھر مصر نے بغیر کسی ادنی ثبوت کے سوڈان پر الزامات کی توپیں کھول دیں۔ اور اسرائیل نے ایران پر تہمت لگا دی۔ لیکن اگر ان تمام سوالات کو نظرانداز کر کے حملے کو حقیقی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس کی اصل وجہ تو خود مصر کے ملکی حالات ہیں، عاقبت نااندیش حکمرانوں نے اپنی پالیسیوں سے پورے مصر کو فقر، بے روزگاری خوف، بدامنی اور ناانصافی کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ مصر کو علاقے میں تمام امریکی پالیسیاں نافذ کرنے کا آلہ کار، اسرائیل کا بچہ جمورا اور تمام اسلام پسندوں کا دشمن نمبر ایک بنا دیا ہے۔ میں ذاتی طور

پہ درجنوں ایسے مصری فرشتہ صفت انسانوں کو جانتا ہوں کہ وہ جب مشرق وسطی یا پاکستان سے مصر جاتے ہیں تو داڑھی منڈوا کر جاتے ہیں تاکہ ایر پورٹ پہ تنگ نہ کیا جائے (یہاں تنگ کرنے کا مطلب ایک دو ماہ کے لیے گرفتاری اور تشدد ہے) مختلف اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ تھوڑے ہی عرصے میں مصر میں سات سو مصری باشندوں کو ان کی اسلامیت کی وجہ سے جاں بحق کیا جا چکا ہے۔ جب تک یہ صورت حال قائم رہے گی تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق قاتلانہ حملے ہوتے ہی رہیں گے۔ اور اگر کبھی ان حملوں کا انتقام پڑوسی ممالک سے لینے کی کوشش کی گئی تو استعماری طاقتوں کے اشاروں پر کی جانے والی اس حماقت سے پورے علاقے کے لیے لامحدود مشکلات شروع ہو جائیں گی۔

تیونس: رجعت قہقری

مسلم سجاد

ایسے وقت میں جب کہ تحریک اسلامی کو کچلنے کے لیے مصر اور الجزائر میں ظلم و استبداد کے حربے آزمائے جا رہے ہیں' تیونس میں (جو ظلم و استبداد میں پیچھے نہیں' لیکن خبروں کا موضوع نہیں) حکمرانوں کو دور رس نئی تدبیر سوجھی ہے: پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کی تمام کتابوں سے اسلام اور اسلامی تہذیب اور اقدار کا ذکر خارج کر دیا جائے۔ حکمرانوں کے خیال میں نہ رہے گا بانس' نہ بجے گی بانسری۔ اس لیے کہ یہ تحریکیں اسکولوں میں ہی طاقت پکڑتی ہیں' ہم انھیں یہیں ختم کر دیں گے۔ یہ صرف اعلان نہیں' بلکہ محمد شرفی نے 'اپنی وزارت تعلیم کے پانچ سالوں میں صدر بن علی کی مکمل حمایت اور راہ نمائی میں یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ ۔۔ ۱۴ صفحات پر مشتمل تمام جماعتوں کے نصابیات اور درسی کتب اسی نقطہ نظر سے تیار کر دی ہیں۔ ملنے آنے والے مہمانوں کو وہ بڑے فخر سے یہ دکھاتے ہیں۔ محمد شرفی نے سیکڑوں ماہرین کے ساتھ خود نشستیں کی ہیں تاکہ تیونس کے اسکولوں کی کتابوں کو جہاد اور خواتین سے امتیازی سلوک اور سیاسی اسلام کے تذکرے سے پاک کر دیا جائے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے کسی ایک کتاب کو بھی نہیں چھوڑا' کسی بھی مسلمان ملک میں ریاست اور مذہب کو علیحدہ کرنے کی یہ جامع ترین مشق تھی۔ یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے' بلکہ جمہوریت سے ہم آہنگ جدید اسلام' پیش کرنے کی کوشش ہے۔ (یہ خوب جمہوریت ہے جس میں ہر کام بزور طاقت عوام کی مرضی کے خلاف کیا جائے)

اس عمل کے دوران' مخلوط تعلیم کو پھر سے رائج کر دیا گیا' قرآنی حصص کو کم کر کے فرائڈ اور دوسرے غیر مسلم مفکرین کو سامنے لایا گیا۔ تاریخ اور جغرافیے میں تیونس کے قبل از اسلام دور کو

اہمیت دی گئی ہے۔ عیسائی دور کو بھی نمایاں مقام دیا گیا ہے (حوالہ: واشنگٹن پوسٹ، ڈاک، ۱۱ جولائی)

امت مسلمہ آج اپنی بدنصیبی سے جن المیوں سے دوچار ہے' اس کی ایک جھلک تیونس کی اس خبر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حصول آزادی کے بعد 'حبیب بورقیبہ پیر تسمہ پا کی طرح ملک پر سوار رہا۔ مغرب کا نہایت محبوب حکمران تھا۔ ان کے مفادات پورے کرتا رہا۔ زین عابدین بن علی نے اس کا تختہ الٹ کر اقتدار سنبھالا تو کچھ امید ہوئی کہ شاید تیونس کے مسلمان عوام کو کچھ آزادی مل جائے۔ ۱۹۸۹ کے انتخابات میں اسلامی تحریک کے افراد کو آزاد حیثیت سے کھڑے ہونے کی اجازت دی گئی۔ انھیں ۱۵ فی صد ووٹ ملے لیکن یہ انتخابی قواعد کا اعجاز تھا کہ سیٹ ایک بھی نہیں ملی۔ لیکن اس کے بعد صدر بن علی نے انھیں کچلنے کے لیے جبر و استبداد کے ہتھیار آزمائے' ایک وقت میں ۸ ہزار لوگ جیلوں میں محبوس رہے۔ نہضۃ الاسلامیہ کے راشد غنوشی مسلسل جلاوطن ہیں۔ جو مظالم ہوئے' ان کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد محمد شرفی کو وزیر تعلیم بنا کر یہ کام سونپا گیا کہ تعلیمی اداروں میں اسلام کے حامیوں کی قوت کو توڑا جائے۔ اب ان وزیر صاحب نے اپنے پانچ سال کی محنت کے نتائج پیش کر دیے ہیں اور حکومت ان کی سفارشات پر عمل پیرا ہے۔

احیائے اسلام کی بڑھتی ہوئی لہروں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان حکمران ہر طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ مغرب اس میں ان کا ساتھی اور سرپرست ہے۔ مسلمان ملکوں کی ساری قوت ترقی و خوشحالی کی طرف قدم بڑھانے کے بجائے عوام اور حکمرانوں کی باہم چپقلش میں ضائع ہو رہی ہے۔

یہ حکمران تاریخ سے سبق سیکھنے کے لیے تیار نہیں اور اپنی قوموں کو ہلاکت اور غلامی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ آزادی کے بعد ہونا تو یہ تھا کہ نظام تعلیم کو مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق تشکیل دیا جاتا لیکن اب ۲۰، ۵۲ سال بعد' جو کچھ نمایشی اسلام نصابات میں آ سکا تھا' اسے بھی کھرچنے کے اقدامات' نئی نسلوں کو کشمکش کا شکار کر کے مفلوج کرنے کے علاوہ' کیا کردار انجام دیں گے۔ مسلمانوں کو اپنے گھروں میں دینی تعلیم کے زیادہ موثر انتظام کرنے ہوں گے۔ جب وسط ایشیا میں روس کا ستر سالہ استبداد' دین نہ مٹا سکا تو تیونس کے حکمران اپنا تختہ الٹنے سے قبل کیا کچھ کر لیں گے۔

بھارت: یکساں سول کوڈ کا مسئلہ

مسلم سجاد

بھارت کی سپریم کورٹ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا کہ ایک ہندو نے اسلام قبول کیا اور اپنی پہلی

ہندو بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کر لی تو اس شادی کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس شادی کو ناجائز قرار دیتے ہوئے سپریم کورٹ نے حکومت سے سفارش کی کہ وہ تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنائے اور اگست ۹۶ تک حلف نامے کے ذریعے عدالت کو آگاہ کرے کہ اس سلسلے میں کیا کچھ کیا گیا ہے۔ اس سفارش نے بھارت کے مسلمانوں کو ایک نئے مسئلے سے دوچار کر دیا ہے۔ بھارت کی سیکولر حکومت' طلاق نکاح اور وراثت کے قوانین کو جو انگریز کے دور غلامی میں بھی مسلمانوں کے لیے نافذ رہے' چھیڑ کر مسلمانوں کی شناخت مٹانے کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی اختیار کر رہی ہے۔ بھارتی دستور کی دفعہ ۴۴ میں یہ کہا گیا ہے کہ حکومت تمام شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کی کوشش کرے گی۔ ۱۹۵۴ میں پنڈت نہرو نے پارلیمنٹ میں سول کوڈ منظور کروایا تو مسلمان اور عیسائی اس سے مستثنیٰ رکھے گئے تھے۔ مسلمانوں کا جب ہی سے یہ مطالبہ ہے کہ دستور سے یہ دفعہ حذف کی جائے۔ اب ۴۱ سال بعد سپریم کورٹ نے اسی کے حوالے سے مسلمانوں میں بے چینی کی لہر دوڑا دی ہے۔

مسلمانوں کے تمام اخبارات و رسائل کے مضامین اور تنظیموں اور راہ نماؤں کے بیانات اس موضوع پر آرہے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کہا ہے کہ جب ملک آزاد ہوا تھا' ہمیں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی۔ یہ اس پر حملے اور شریعت میں دخل اندازی ہے (ماہنامہ اسلامک موومنٹ دہلی' جولائی ۹۵) دستور کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ کے تحت ہر مذہب کے ماننے والوں کو عقائد کی اور تبلیغ کی آزادی دی گئی ہے۔ یکساں سول کوڈ اس پر براہ راست حملہ ہوگا۔ کہا جا رہا ہے کہ اس سے قومی یک جہتی کا نصب العین حاصل ہوگا' سیکولرازم کی تکمیل ہوگی' اور جدید تقاضے پورے کیے جاسکیں گے جب کہ دراصل یہ خانہ جنگی کی دعوت ہوگی' اسلامی اقدار کی بیخ کنی ہوگی' مسلمان ذہنی انتشار کا شکار رہیں گے اور ملی تشخص پامال ہوگا۔

بھارت کے مسلمان اقلیت ہیں لیکن دنیا میں مسلمانوں کی تیسری بڑی آبادی ہیں۔ بھارت کی ۹۲ کروڑ آبادی میں ۱۵' ۱۶ کروڑ۔ بابری مسجد کی شہادت سے ان کے لیے ابتلا کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ دہشت گردی کا خصوصی قانون ٹاڈا (TADA) نافذ ہوا' جس کے تحت پولیس تحویل میں اعتراف کردہ جرائم پر سزا دی جاسکتی ہے۔ ستر ہزار سے زائد مسلم نوجوان تعذیب اور سزا کے ناقابل بیان مراحل سے گزرے۔ ندوۃ العلما پر پولیس کے چھاپے نے تمام مسلمانوں کو' خصوصاً دینی حلقوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

گذشتہ صوبائی انتخابات میں' راجستھان اور دہلی کے بعد اب گجرات اور مہاراشٹر میں بھی شیوسینا اور بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ اور مسلمانوں کو معلوم ہو رہا ہے

کہ اگر یہ پارٹیاں اقتدار میں ہوں، تو دستور کی دی گئی مذہبی آزادی کے تحفظ کا کیا مطلب رہ جاتا ہے۔

مہاراشٹر میں ۱۹۹۲ میں اقلیتی کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس کا سوائے سفارش اور مشورے کے کوئی کردار نہیں، لیکن وزیراعلیٰ نے یہ کمیشن بھی یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے: یہ اقلیتوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے کی طرف پہلا قدم ہے ' اس طرح کے کمیشنوں سے اختلافات میں اضافہ ہوتا ہے۔ بمبئی میں ..۲ مساجد ہیں۔ آزادی کے بعد صرف ایک مسجد کا اضافہ ہوا ہے۔ ۳'. ۴ مساجد ایسی ہیں جہاں جمعہ کے دن نمازی سڑکوں تک آجاتے ہیں۔ حکومت اس پر پابندی لگانا چاہتی ہے۔ جمعیت العلما کے ایک وفد کو وزیراعلیٰ نے یقین دہانی کرائی کہ مساجد میں اضافی منزل کی تعمیر کی اجازت دی جائے گی لیکن بعد میں یہ تجویز مسترد کر دی گئی۔

۱۹۹۶ کے عام انتخابات قریب ہیں۔ سب پارٹیوں کی نظریں اس پر اور مسلمانوں کے ووٹوں پر ہیں۔ بی جے پی کے صدر آڈوانی نے اپنے کارکنوں سے کہا ہے کہ وہ اقلیتوں کے اندیشے ' صرف بیانات سے نہیں 'بلکہ اپنے کام سے بھی دور کریں۔ اور شیو سینا کے بال ٹھاکرے کو بھی نصیحت کی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف بولنے میں احتیاط کریں۔ پارٹی کے اقلیتی شعبے کے سربراہ عارف بیگ نے تین "ت" کا منصوبہ بنایا ہے۔ تعلیم 'تنظیم 'تجارت۔ وہ مدرسوں میں انگریزی 'ہندی اور حرفی تعلیم رائج کرنے کے حامی ہیں۔

اپریل میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بھی ہوا۔ مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے ۱۵ نکاتی '. ۲ نکاتی پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ جب تک نرسیما راؤ ہیں ' کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جب وہ آندھرا پردیش کے وزیراعلیٰ تھے تو انھوں نے ۱۹۷۱ کی جنگ میں ریڈیو پاکستان سننے والوں کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے کی بات کی تھی۔

بھارت کے مسلمان آزادی کے بعد ہی سے مسلسل آزمایشوں کا شکار رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات میں جان و مال اور عزت و آبرو لٹاتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی شناخت محفوظ رکھنے کے لیے مسلسل سعی اور جدوجہد کی ہے۔ انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا ہے۔ بلکہ حالات نے انھیں زیادہ پرعزم اور باعمل بنا دیا ہے۔ آنے والے انتخابات سے پہلے ان کے تمام گروہوں کو سوچ سمجھ کر کوئی ایسی مشترکہ حکمت عملی اپنانا چاہیے کہ جس سے مستقبل میں مسلمانوں کو مناسب تحفظ ملے 'اور وہ بھارت کے مستقبل میں اپنا حقیقی کردار ادا کر سکیں۔

سید مودودی انسٹی ٹیوٹ

پاکستانی طلبہ کا داخلہ

میٹرک فرسٹ ڈویژن اور ایف-اے پاس طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں

ذریعہ تعلیم انگلش اور عربی ہے

پانچ سالہ ڈگری کورس قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ، اکنامکس، پولٹیکل سائنس، ایجوکیشن، نفسیات، سوشیالوجی، دور حاضر کی اسلامی دنیا، تحریکات اسلامی، منطق، فلسفہ، بلاغت، عربی ادب اور صرف و نحو کے علاوہ بی اے تک مروج انگریزی نصاب۔

فراغت کے بعد کلیة الشريعة و الثقافة سے بی اے کی ڈگری دی جاتی ہے جسے پنجاب یونیورسٹی نے بی اے کی ڈگری کے مساوی قرار دیا ہے۔

عربی سکھانے کے لیے عرب اساتذہ۔

۵ اگست ۱۹۹۵ تک درخواستیں دی جاسکتی ہیں۔

۱۵ اگست ۹۵ کو داخلہ ٹیسٹ ہوگا۔

فیس داخلہ ایک ہزار (-/1000) روپے ہوگی۔ ماہانہ فیس -/300 روپے اور ہوسٹل کا ماہانہ کرایہ -/300 روپے ہوگا۔ اخراجات طعام -/600 روپے ماہانہ اندازاً

رجسٹرار

سید مودودی انسٹی ٹیوٹ

وحدت روڈ لاہور 54570

فون: 5416694 - 5413517

انگریزی اور تعلیم

"انگریزی زبان اور ہماری تعلیمی پالیسی" (اپریل ۹۵) کے مطالعے سے جو تاثر میرے ذہن پر طاری ہوا، مختصر طور پر اس کو قلم بند کر کے پیش کر رہا ہوں۔

برصغیر میں "مملکت آصفیہ" مشرقی علوم و افکار اور تہذیب و تمدن میں ڈھلی ہوئی واحد ریاست تھی۔ یہاں اردو سے قبل فارسی کا چلن تھا۔ بعد میں اردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ اس مملکت کے آخری تاجدار نواب میر عثمان علی خاں، برطانوی ہند میں مکمل مشرقی روایات و خصوصیات کے حامل حکمران تھے۔ انگریز اقتدار میں بھی انھوں نے اپنی ریاست میں مشرقیت کو فروغ دیا۔ وہ خود انگریزی زبان پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود حتی الامکان فارسی و اردو زبان میں اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ اپنے دورِ زرّیں میں انھوں نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے اردو زبان کی ایک یونی ورسٹی کے قیام کا اعلان کیا۔ چنانچہ مملکت آصفیہ میں تحتانیہ سے لے کر تمام اعلیٰ مدارج تک اردو زبان ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ اس مملکت کی تباہی کے پندرہ بیس برس بعد بھی یہی نظام تعلیم رائج رہا۔ اور خاص بات یہ تھی کہ اردو ذریعہ تعلیم کے باوجود انگریزی کا معیار کبھی کم نہ ہوا۔ اس زمانے کا میٹرک کا طالب علم اس دور کے انگلش میڈیم کے گریجویٹ سے زیادہ بہتر انگریزی پڑھ لکھ سکتا تھا۔ عہد آصفی میں نرسری اور کنڈر گارٹن کا رواج عام نہ تھا۔ عموماً پانچ یا چھ سال کی عمر میں بچوں کو مدرسہ تحتانیہ داخل کیا جاتا تھا اور تیسری جماعت سے انگریزی زبان کو بحیثیت مضمون شامل کیا جاتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس مملکت میں انگریزی کے مسیحی مشن اسکول جگہ جگہ قائم ہو چکے تھے لیکن طلبہ کی بڑی تعداد اردو میڈیم کے مدارس میں نہایت معمولی فیس پر شریک ہو کر تعلیم کی تکمیل کیا کرتی تھی۔ ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی لیکن ان مدارس کے فارغ التحصیل نوجوان اردو اور انگریزی نوشت و خواند میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ محکمہ تعلیم کا بے مثال نظم و نسق تھا۔ تعلیم نسواں کا انتظام اس درجہ اعلیٰ و ارفع تھا کہ آج کے کسی بھی مسلم ملک میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس میں ریاضی، سائنس اور آرٹس کے تمام مضامین کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اساتذہ کا معیار تعلیم اور اخلاق درجہ بہت بلند ہوا کرتا تھا۔

ہندستان آزاد ہوا' پاکستان بنا پھر بنگلہ دیش بھی وجود میں آگیا لیکن اہل مشرق کے لیے وجہ افتخار جو تعلیمی تجربہ مملکت آصفیہ میں کیا گیا تھا' وہ دور آزادی و جمہوریت میں فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ سے اردو ذریعہ تعلیم کو ختم کر کے انگریزی زبان کو نافذ کر دیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نئی نسل انگریزی تعلیم و تہذیب میں پل کر جوان ہو چکی تھی۔ آزادی تو ملی مگر قلب و نظر کی تبدیلی کے بعد ملی۔ اس موقع پر جگر مراد آبادی مرحوم کا ایک عاشقانہ شعر برطانوی پالیسی کے فہم و ادراک میں بھرپور مدد دیتا ہے:

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا	کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے

برصغیر کے تینوں سیاسی حصے' ہندستان' پاکستان اور بنگلہ دیش' آج زندگی کے یکساں مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ اردو زبان' حقیقتاً برصغیر کی لسانیات کے ارتقا کی مظہر ہے لیکن کم نظری سے یہ ہر مقامی زبان کے مقابل رکھ کر دیکھی جانے لگی۔ فکر مغرب کے ساختہ اذہان' آج حقیقی قومی ورثے کی قدر و منزلت سے محروم ہو چکے ہیں۔ مادی ترقی اور خوشحالی کے افسانوی معیارات' آج انسان کو حیوانوں کی طرح چراگاہوں کی تلاش میں سرگرداں کیے ہوئے ہیں۔ ناکام حکومتوں نے تعلیم اور طبی اداروں کو کاروباری افراد کے حوالے کر دیا ہے۔ اس دور کے مدارس اور جامعات پر educational stores کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ تعلیم گاہوں میں داخلوں پر ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد' طلبہ کے سرپرستوں اور والدین کو یہ احساس فکرمند کیے رہتا ہے کہ ان کے بچے ڈالر' پونڈ اور دینار و درہم کے علاقوں میں جلد جا پہنچیں۔

آج کے تعلیمی رجحانات میں مصنوعات کی طرح ایکسپورٹ کوالٹی کا تصور عام ہو چکا ہے۔ اور پورا برصغیر انسانی وسائل کی منڈی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس وقت پورے برصغیر کا نہ صرف معاشی بلکہ ثقافتی مستقبل تاریک ہے۔ جب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ان ملکوں سے سرمایہ دار ملکوں کو منتقل ہو جائیں گے تو غریب اور مزدور طبقہ کے ذریعے کسی ملک کو ثقافتی بلندی کس طرح نصیب ہو گی۔

مسلم سجاد نے پاکستان میں تعلیم کا جو حال زار لکھا ہے' اس میں صدر ایوب خاں' ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر کی غلامانہ پالیسیاں کارفرما ہیں۔ پہلی جماعت سے لازمی انگریزی تعلیم کا آغاز' تمام دنیا کے ماہرین تعلیم کو حیرت میں ڈال دے گا۔ کسی بھی زرخرید لیڈر کے ذریعے کسی بھی قوم کی گردن میں غلامی کا پھندا ڈالا جا سکتا ہے اور آج امریکہ یہی کام مختلف ملکوں میں انجام دے رہا ہے۔ اس وقت مسئلہ صرف انگریزی ذریعہ تعلیم کا نہیں بلکہ نو آزاد ممالک میں مشرق و مغرب کی کشمکش کا ہے' زندگی کے ہر شعبے میں یہ کشمکش جاری ہے۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کسی ملک میں ایک مضبوط تعلیمی نظام کے لیے' ایک مستحکم سیاسی نظام ضروری ہے۔ (وحید الدین سلیم حیدر آبادی)

رسائل و مسائل

والدین کے حقوق

میرا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ جن کا مسلک دیوبند ہے' میرے والد صاحب تقریباً ۲۵ سال امام رہے۔ میرے بڑے بھائی ایم اے ایل ایل بی ہیں۔ میں جیسے جیسے جماعت کے نزدیک آیا۔ مجھے اسلام کو سمجھنے کا موقع ملا! لیکن ساتھ ہی ساتھ گھر میں میرے لیے مشکلات پیدا ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ گھر والوں نے جماعتی رابطے ختم کرنے کا حکم دیا۔

میں ایک دن گھر والوں کو صرف مطلع کر کے ۷ روزہ تربیت گاہ میں شامل ہو گیا۔ سات روز کے بعد جب گھر پہنچا تو ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ والد صاحب اور بڑے بھائی نے بولنا چھوڑ دیا۔ بلکہ والد صاحب نے دو لفظی فیصلہ سنا دیا کہ یا تو تم جماعت کو چھوڑ دو یا ہمیں چھوڑ دو۔ میں فوری جواب میں صرف اتنا کہہ سکا کہ "میرے لیے جماعت چھوڑنا ناممکن ہے"۔ انھوں نے کہا کہ تم ہمیں چھوڑ دو گے اور پھر انھوں نے بالکل بولنا چھوڑ دیا۔ میں ۳ روز تک مسلسل والد صاحب سے معافی مانگتا رہا مگر انھوں نے معافی دینے سے انکار کر دیا (بعد میں آہستہ آہستہ انھوں نے بولنا شروع کر دیا) وہ کہتے ہیں کہ ہم تمھیں نماز روزے سے نہیں روکتے۔ نیک کام سے نہیں روکتے۔ لیکن ہم تمھیں کسی جماعت میں خصوصاً جماعت اسلامی میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ اسی وجہ سے گھر کا ماحول کشیدہ ہے۔ مجھ سے چھوٹا اپنے آج کے دور کے دوستوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اکثر نماز نہیں پڑھتا (خصوصاً فجر کی نماز) ہر وقت گانے سنتا ہے حتیٰ کہ سب گھر والے ٹی وی پر ڈرامے اور فلم' چترہار شوق سے دیکھتے ہیں۔ جب میں انھیں کہتا ہوں کہ یہ تمام چیزیں غلط ہیں' آپ انھیں چھوڑ دیں تو میں جماعت کو چھوڑ دوں گا' تو وہ کہتے ہیں کہ تم ہم سے بدلہ لو گے۔ تم ہم سے پیدا ہوئے ہو ہم تم سے نہیں۔ ٹی وی' وی سی آر تو بڑے بڑے مولوی اور علما کے گھر ہیں۔ خود تمھاری جماعت کے بڑے بڑے "لیڈروں" کے گھر میں چلتے ہیں۔ انھیں منع کرو۔

میں ان حالات میں بہت پریشان ہوں۔ ہر وقت ذہنی دباؤ کا شکار رہتا ہوں۔ اگر ان کی نافرمانی

کردوں تو وہ کہتے ہیں کہ تم جنت سے دور جا رہے ہو کیونکہ ہم تمھیں کفر پر مجبور نہیں کر رہے اس لیے تم ہماری مانو۔ اگر نہیں مانتا تو جگ ہنسائی بھی ہوتی ہے اور گھر کا ماحول بھی خراب ہوتا ہے (میرے گھر والوں کو سوائے جماعت اسلامی کے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے) میں اپنے گاؤں کا ناظم ہوں۔ الحمد للہ کام بھی صحیح ہو رہا ہے (میں پیشے کے لحاظ سے ایک پرائمری ٹیچر ہوں) میں ناظم زون سے التجا بھی کر چکا ہوں کہ آپ مجھے ناظم نہ بنائیں بلکہ کسی اور کو بنائیں مگر ان کا مطالبہ تو یہ ہے کہ تم رکن بنو۔ اگر استصواب رائے ہو تو تب بھی مجھے ناظم منتخب کر لیتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ مستعفی ہو کر گھر بیٹھ جاؤں مگر ضمیر ملامت کرتا ہے۔

اب آپ شریعت کے حوالے سے یہ بات بتائیں کہ میرے والد صاحب کا مطالبہ کہاں تک درست ہے؟ میرا جواب کہیں ان کی نافرمانی تو نہیں تھا؟ میں نہ ان کو چھوڑ سکتا ہوں نہ ہی جماعت کو' اس صورت میں میرا جواب کیا ہو؟ اگر خدانخواستہ ایسے حالات ہوں کہ وہ بہت زیادہ سختی سے فیصلہ چاہیں تو کیا شریعت اجازت دیتی ہے کہ میں گھر چھوڑ دوں یا پھر جماعت چھوڑ دوں؟ کیا میں ٹی وی وغیرہ سے پرہیز کے لیے مطالبہ کر سکتا ہوں؟ اگر ناظم زون مجھے نظم سے علیحدہ کر کے بطور رکن کام نہ لیں اور کارکنان بھی اپنی رائے میرے حق میں دیں' میں پھر بھی ذمہ داری نہ قبول کروں بلکہ گھر بیٹھ جانے کی بات کروں تو کیا اللہ تعالیٰ اس پر گرفت تو نہ کرے گا۔

دینی فرائض کی ادائیگی میں اگر دو فرائض کے درمیان بظاہر تنازع پیدا ہو جائے تو مشکل صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ضابطوں کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

اقامت دین' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوت و تبلیغ کے لیے بحد استطاعت کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یہ اللہ اور اس کے دین کا حق ہے جو اس کے اوپر عائد ہوتا ہے۔ یقیناً آپ نے جماعت اسلامی میں شرکت اس لیے اختیار کی ہے کہ آپ اس فرض کی ادائیگی' اور ادائیگی کے لیے اجتماعی سعی و جہد کے ناگزیر ہونے پر مطمئن ہیں۔ والدین کے حقوق بھی دینی فرائض میں اتنے اہم فرائض ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے بعد انھی کے حق کی تاکید فرمائی ہے (سورۃ لقمان ۱۳:۳۱)۔

اگر ان دونوں فرائض کی ادائیگی کے درمیان تصادم و کشمکش ہو جائے تو آدمی کیا کرے؟ ایک اصول تو بالکل واضح ہے کہ کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جا سکتی جس سے خالق کی معصیت ہوتی ہو۔ دوسرا اصول' ایسی ہی صورت حال میں' قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر والدین "میرے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے لیے مطالبہ کریں اور دباؤ ڈالیں' تو ان کا کہنا مت مانو"۔ (لقمان ۱۵:۳۱- العنکبوت ۸:۲۹)

لیکن ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی میں شمولیت سے روکنے کے لیے دباؤ' شرک کے لیے دباؤ کے برابر تو ہرگز نہیں۔ ان دو راہ نما اصولوں کے بعد' ہمیں مزید راہ نمائی اس بنیادی اصول سے ملتی ہے کہ اگر ایک معروف کی تعمیل سے زیادہ بڑے معروف کا ترک لازم آتا ہو' یا ایک منکر کے ترک سے دوسرا بڑا منکر پیدا ہوتا ہو' تو اس معروف کی تعمیل اور اس منکر کے ترک سے اجتناب جائز اور صحیح ہے۔ اپنے رسالہ حقوق الوالدین میں مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں: اگر سفر فرض و واجب نہ ہو' اور والدین اس سفر سے منع کریں' تو ان کے کہنے سے سفر نہ کرنا ضروری نہیں (یہ مسئلہ درمختار اور عالمگیری میں موجود ہے)۔ اگر سفر فرض اور واجب ہو تو بطریق اولیٰ یہ حکم ہو گا۔ یہ اس صورت میں ہے کہ والدین اپنی ضروری خدمت کے لیے محتاج نہ ہوں۔ مذکورہ صورتوں میں والدین کو کوئی رنج و تکلیف ' واقعی اور قابل اعتبار نہیں۔ اس لیے اس صورت میں والدین کے خلاف کام کرنا درست ہے' نہ حرام نہ مکروہ۔

اسی طرح اگر والدین کو ضروری حاجت نہ ہو' تو ان کے حکم سے اپنا زائد مال دینا ضروری نہیں۔ والدین اگر' بغیر احتیاج خدمت' نوافل پڑھنے کو منع کریں تو اس صورت میں ان کا کہنا ماننا ضروری نہیں۔ اگر والدین حقہ تیار کرنے کی فرمایش کریں (حقہ پینا سخت مکروہ تنزیہی ہے) تو اولاد پر اس کہنے پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ ایک فعل مکروہ کا مرتکب ہوتا ہے جو شرعاً مذموم ہے۔ اگر کسی کی بیوی سے کوئی واقعی رنج اور تکلیف والدین کو نہ پہنچتی ہو' اور وہ خواہ مخواہ حکم دیں کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو' تو اس حکم کی تعمیل ضروری نہیں۔ اس صورت میں طلاق دینا عورت پر ایک طرح کا ظلم کرنا ہے' خواہ مخواہ طلاق دینا ظلم اور مکروہ تحریمی ہے۔ نکاح تو وصال کے لیے موضوع ہے' یہ فراق بلاوجہ کیسے روا ہو سکتا ہے (فتح القدیر)۔

والدین کسی مستحب کام سے روکیں ' اور اپنی کسی ضروری حاجت (واقعی اور معتبر) کی وجہ سے روکیں' تو ان کے حکم کی تعمیل واجب ہے۔ خواہ مخواہ روکیں تو واجب نہیں ہے۔

حدیث میں ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرنا' افضل ہے نماز سے اور روزے سے اور حج سے اور عمرے سے اور جہاد سے راہ خدا میں: یہ حدیث ثابت نہیں اس لیے قابل اعتبار نہیں (شوکانی: فوائدمجموعہ)۔ اور قاعدہ شرعی کے خلاف بھی ہے۔

اولاد نافرمان جب ہی ہوگی جب ان کے حقوق ضروریہ ادا نہ کرے۔ پس والدین کی اطاعت اور رضاجوئی کا حکم مطلقاً نہیں۔ جن امور میں اطاعت والدین شریعت نے لازم کی ہے' ان امور میں کوتاہی نہ کرے۔ باقی سب کام شرع کے موافق کرنا جائز ہیں۔

بیوی پر شوہر کی اطاعت بدرجہ اولیٰ واجب ہے لیکن اس کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں: فساد سے بچنے کے لیے' جائز اور مکروہ تنزیہی امور میں اس کی اطاعت کر سکتی ہے۔ہاں فرض ' واجب و سنت موکدہ کو اس کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتی۔ بغیر شوہر کی اجازت کے کسی بزرگ سے بیعت ہونا جائز ہے۔ہاں کسی فساد کا اندیشہ ہو تو اس فساد کو رفع کرنے کی وجہ سے یہ جائز ہے کہ بیعت نہ ہو۔مگر 'اگر باہمت ہو تو اللہ کے بھروسے پر بیعت ہو جائے۔لیکن پھر کوئی رنج اس وجہ سے پیش آئے تو صبر کرے ' ناشکری نہ کرے۔

مولانا تھانوی کا مقام محتاج بیان نہیں۔کیونکہ آپ کے والد دیوبندی مسلک کے ہیں' ۲۵ سال سے امام ہیں' اس لیے ان کا فتویٰ بدرجہ اولیٰ ان کے لیے حجت ہونا چاہیے۔آپ چاہیں تو مولانا تھانوی کا رسالہ حقوق الوالدین کہیں سے حاصل کر کے پڑھ لیں۔

اقامت دین اور دعوت و تبلیغ کے کام کو آپ کے والد صاحب واجب نہ بھی تسلیم کریں' تو بھی اس کے سنت موکدہ ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔اسی طرح جماعت میں شمولیت' کم سے کم' کسی بزرگ کی بیعت سے بہت مختلف یا کم تر چیز تو نہیں۔

اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ والدین کی اطاعت کی خاطر جماعت اور جماعت کے کام کو ترک کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔اس معاملے میں ان کا کہنا نہ ماننا کسی طرح بھی ان کی نافرمانی نہیں قرار دیا جا سکتا' جیسا مولانا تھانوی نے اس سے کم تر درجہ کے کاموں کے بارے میں واضح کیا ہے۔

یہ تو ہیں قواعد و ضوابط۔لیکن معاشرت میں قواعد و ضوابط کے ساتھ احسان ' نرمی ' رحمت اور حکمت کی چاشنی بھی ناگزیر ہے۔اس لیے آپ 'یا کوئی اور ' صرف ان قواعد و ضوابط کے حوالے دے دے کر معاملات کریں گے تو معاشرت میں فساد پیدا ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ "کہنا ماننا ضروری نہ ہونے" اور "کہنا نہ ماننا ضروری ہونے" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔اس لیے یہ ضروری نہیں 'بلکہ مستحسن و مطلوب نہیں 'کہ جہاں ماننا ضروری نہیں ' وہاں آپ لازماً نافرمانی کریں۔واجبات شرعی اور حق تلفی کے علاوہ ' ہر کام میں اجازت لینا' اطلاع دینا ' اور کوئی ضرر نہ ہو تو ضرور کہنا ماننا یہ ضروری بھی ہے اور آپ کے مقصد کے لیے مفید بھی۔

دوسری بات وہی ہے جو قرآن نے واضح طور پر بیان کر دی ہے کہ کہنا نہ مانو مگر دنیا میں ان کے ساتھ معروف کے مطابق معاشرت رکھو۔بلکہ آپ کے حالات میں اس سے بڑھ کر۔جتنی نرمی' عاجزی 'تابع داری اور خدمت کر سکیں' وہ کریں۔اور کوئی بھی غیر ضروری نزاع اور جھگڑا مول نہ

لیں۔

تیسری بات ' جو دوسری کا تقاضا ہے ' وہ یہ ہے کہ ٹی وی اور چھوٹے بھائی کی نماز جیسے منکرات کے ازالے کے پیچھے ابھی نہ پڑیں بلکہ ان کو نظرانداز کر دیں۔ جب بڑا مسئلہ طے ہو جائے تو حکمت اور نرمی کے ساتھ ان کے حل کی راہ ان شاء اللہ نکل آئے گی۔

یہ کہنا کہ آپ لوگ یہ چیزیں چھوڑ دیں ' میں جماعت چھوڑ دوں گا ' غلط بھی ہے اور خلاف حکمت بھی۔ غلط اس لیے کہ دونوں کا تبادلہ ممکن نہیں۔ بظاہر یہ لاجواب اور عاجز کر دینے والی دلیل ہے ' جو حکمت کے خلاف ہے۔

اسی طرح آپ جماعت کے کیا کام کریں ' کون سی ذمہ داری اٹھائیں ' اس میں آپ کو معاشرتی فساد کے امکان اور اپنی استطاعت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ نظم جماعت کو بھی اسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حکمت ' نرمی اور استقامت کے ساتھ چلنے کی توفیق دے ' اور آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔

ٹی وی اور والدہ کی ناراضی

میں نے اپنے گھر میں ٹی وی لگانا بند کر دیا ہے۔ کیونکہ آج کل جو بے ہودہ قسم کی نشریات آرہی ہیں وہ دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ میرے گھر والے مجھ سے ناراض ہیں ' خاص کر والدہ۔ کیا میں اس سلسلے میں والدہ کا حکم مانوں یا انکار کر دوں۔ یہ بھی بتایئے کہ امیر جماعت کے گھر میں ' آپ کے گھر میں یا دوسرے قائدین کے گھر میں ٹی وی ہے یا نہیں۔

ٹی وی پر جس قسم کے پروگرام آرہے ہیں وہ بے شمار مفسدات پیدا کرتے ہیں ' بعض پروگراموں کو دیکھنا دل و نگاہ کو آلودہ کرتا ہے ' اس لیے آپ نے بہت اچھا کیا کہ گھر سے ٹی وی کو نکال باہر کیا۔ آج کے دور میں یہ ایک بہت بڑا مجاہدہ ہے ' اور مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عنایت کرے گا۔

کیونکہ آپ نے ٹی وی اس لیے گھر سے نکالا ہے کہ اس کا رکھنا اور دیکھنا معصیت الٰہی ہے ' اس لیے اس معاملے میں کسی مخلوق کی ناراضی کے ڈر سے اس کی اطاعت کرنا صحیح نہیں ہے۔ "خالق کی نافرمانی ہو تو مخلوق کی اطاعت جائز نہیں" خواہ یہ مخلوق آپ کے والدین ہی ہوں۔ کسی منکر کو کرنا اس وقت قابل برداشت ہو سکتا ہے جب اس کو ترک کرنے سے زیادہ بڑا منکر پیدا ہوتا ہو۔ آپ کی والدہ کی ناراضی اتنا بڑا منکر اور فساد نہیں کہ آپ اس چیز میں مبتلا ہوں جسے آپ معصیت الٰہی سمجھتے ہیں۔

میرے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔ اور بھی گھر ہوں گے جہاں نہیں ہو گا لیکن میں اس معاملہ میں

تجسس نہیں کرتا کہ امیر جماعت کے گھر میں یا کسی اور کے گھر میں ہے یا نہیں۔ اور اگر علم ہو' تو اس کو روکنے کے لیے عملی اقدام کو موجودہ حالات میں مبنی بر حکمت نہیں سمجھتا۔ ٹی وی فی نفسہ ناجائز نہیں ہے' پروگراموں کی وجہ سے قابل اجتناب ہے۔ لیکن بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ وہ صرف وہی پروگرام دیکھتے ہیں جن کے دیکھنے میں قباحت نہیں مثلاً خبریں' تقریریں' دینی پروگرام' کرنٹ افیرز' تعلیمی پروگرام۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم بچوں کو صرف تعلیمی پروگرام دیکھنے دیتے ہیں' اگر نہ رکھیں تو وہ پڑوس میں جاکر سب کچھ دیکھیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی احتیاط بہت مشکل ہے۔ لیکن بہرحال کسی فتوے اور عملی اقدام کی گنجایش نہیں رہتی۔ جب بلوہ عام ہو تو تذکیر عام پر اکتفا کرنا ہی بہتر ہے۔

ٹی وی پر ناچ گانا دیکھنا

۱۔ جو لوگ طوائفوں کا گانا سننے جاتے ہیں یا انھیں گھر پر بلاتے ہیں انھیں تو ہم برے "القاب" سے نوازتے ہیں۔ لیکن ہم جو گھر بیٹھے انھی عورتوں کا ناچ گانا ٹیلی وژن پر سنتے ہیں کیا ہم بھی انھی القاب کے مستحق نہیں؟ کیا ہم کہ جن کی بدولت ناچنے گانے والے روزی کماتے ہیں ان سے کہیں زیادہ سزا کے مستحق نہیں؟

۲۔ کیا شادی بیاہ کے موقع پر یا شادی کی ویڈیو میں "نامحرم رشتہ دار" عورتوں کا ناچ گانا دیکھنا بھی ایسا ہی ہے کہ جیسے ناچنے گانے والی عورتوں کا گانا سننا؟ یعنی کیا دونوں کا گناہ برابر ہے؟

۱۔ کسی شخص کو بھی برے القاب سے نوازنا صحیح نہیں۔ حضورؐ نے ایک زانی' ایک شراب خور' ایک منافق اور ایک مخلص مگر خطاکار کو بھی برے الفاظ سے پکارنے سے منع فرمایا ہے۔ قرآن کا حکم ہے بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ اس لیے طوائفوں کا گانا ناچنا دیکھنے سننے والوں یا ٹیلی وژن پر دیکھنے سننے والوں دونوں کا فعل برا ہے' لیکن دونوں کو محبت اور ہمدردی سے راہ راست پر لانا چاہیے۔

۲۔ نامحرم رشتہ دار ہوں یا طوائفیں' دونوں کا ناچ گانا دیکھنا اور سننا یکساں طور پر گناہ ہے۔ نامحرم رشتہ داروں کے ناچنے گانے میں بے غیرتی اور رذالت بھی شامل ہو جاتی ہے۔

روحانی علوم

۱۔ اسلام اور تصوف میں کیا تعلق ہے؟ کیا ایک مسلمان روحانی علوم حاصل کر سکتا ہے؟ اور اس مقصد کے لیے کیا کسی پیرو مرشد سے بیعت ہو سکتی ہے؟

۲۔ کیا ایک مسلمان اپنے اندر موجود مخفی قوتوں یا صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتا ہے؟ یا دوسرے

نفلوں میں آدمی اپنے اندر موجود مخفی صلاحیتوں (ٹیلی پیتھی (انتقال خیال) وغیرہ) کو بیدار کر سکتا ہے اور کیا یہ جائز عمل ہے؟

۱۔ تصوف کی تعریفیں اور شکلیں بے شمار ہیں۔ تصوف کے معنی اگر تزکیہ ہو' منزل احسان کا حصول ہو' اللہ اور اس کے رسول ؐ کی محبت پیدا کرنا ہو' اعمال صالحہ بجا لانے کے لیے شوق و استعداد پیدا کرنا ہو' قرب الٰہی کا حصول ہو' اور یہ سب قرآن و سنت کے دائرہ میں اور احکام الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ہو (کہ اس کے بغیر یہ ہو نہیں سکتا)' تو یہ تصوف اسلام کا ایک شعبہ ہے۔ جہاں' جتنا تجاوز ان اصولوں سے ہو گا' اتنا ہی حصہ اسلام کے خلاف ہو گا۔ (اس سلسلے میں آپ رسائل و مسائل' حصہ سوم' ص ۴۴۰ دیکھیں۔)

۲۔ روحانی علوم سے مراد اگر وہ علوم ہیں جن سے روح کا تزکیہ ہوتا ہو تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اگر وہ علوم ہوں جن سے انسان کو اپنے اوپر یا اشیا کے اوپر غیر معمولی قدرت حاصل ہو جائے' تو جب تک یہ حصول شریعت کے دائرے میں ہو اور اس کا استعمال بھی' اس میں بھی کوئی ہرج محسوس نہیں ہوتا۔

۳۔ بیعت اگر اندھی تقلید کے ساتھ مشروط نہ ہو' صالح' باعلم اور پابند شریعت شیخ سے ہو' اور غرض اپنے نفس کا تزکیہ ہو' تو میرے نزدیک اس میں کوئی ہرج نہیں۔

۴۔ ساری ہی صلاحیتیں مخفی ہوتی ہیں۔ پھر آدمی ان کو اجاگر کرتا ہے۔ تحریر ہو یا تقریر ہو' انتظام ہو' سائنس ہو' ادب ہو' جب تک ذرائع جائز ہیں' صلاحتیں جائز ہیں' ان کا استعمال جائز ہے۔ میرے خیال میں اپنی مخفی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر آدمی لکھنا اس لیے سیکھے کہ فحش نگاری یا کفر کی حمایت کرتا ہے تو وہ بھی ناجائز ہو گا۔

کتاب نما

پاکستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا سیاسی کردار: منیر احمد۔ ناشر: گورا پبلشرز، لوئر مال، لاہور۔ صفحات: ۲۹۴+۲۸، قیمت: ۳۰۰ روپے۔

مصنف کے الفاظ میں کتاب کا مقصد تالیف ''خفیہ سروس کے اداروں کی خامیوں اور خوبیوں کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے'' (ص ۲)۔ زور اس امر پر دیا گیا ہے کہ ''خفیہ اداروں کا بھی احتساب کیا جانا چاہیے۔ ان کا کام یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے فیصلے حکومت وقت سے زبردستی تسلیم کرائیں'' (ص ۱۰)۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ بہت سے پاکستانی سیاست دان اقتدار حاصل کرنے کے لیے انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ٹاؤٹ بن جاتے ہیں اور ملک دشمن قوتوں کی مدد لینے میں [بھی] عار محسوس نہیں کرتے (ص ۲)۔ دوسری جانب ''حکمران اپنی کرسی [اقتدار] بچانے کے لیے اپنے ہی ملک کی دوسری خفیہ ایجنسی کی جاسوسی کرنے پر لگ جاتے ہیں'' (ص ۲)۔

مصنف 'روزنامہ ''فرنٹیر پوسٹ'' کے نامہ نگار ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار بلخ شیر مزاری کی وزارت عظمیٰ کے دور میں شائع ہوئی تھی۔ پیپلز پارٹی نے برسراقتدار آتے ہی اس پر پابندی عائد کر دی مگر عدالت نے یہ پابندی ختم کر دی۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن چھپا ہے۔ موضوع کی نزاکت کے پیش نظر مصنف نے بڑی احتیاط سے کام کیا ہے۔

مصنف نے بتایا ہے کہ ''خفیہ سروس کے اداروں کا سیاست میں ہمیشہ ہی سے ایک مخصوص کردار رہا ہے۔ یہ کردار ہمیں انگریز سے ورثے میں ملا تھا'' (ص ۱۷)۔ ''سب سے پہلے لیاقت علی خاں نے خفیہ سروس کے اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا'' (ص ۱۸) اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ اگرچہ انٹر سروسز انٹیلی جنس (ISI تشکیل: ۱۹۴۸) اپنے طور پر سیاست دانوں کی نگرانی کیا کرتی تھی (ص ۱۹) لیکن اس کے اندر [باقاعدہ] سیاسی سیل وزیر اعظم بھٹو نے قائم کیا۔ (ص ۱۲)۔ مزید برآں انھوں نے انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) کو بھی پیپلز پارٹی کے مخصوص مفادات و مقاصد کے لیے استعمال کیا (ص ۲۵)۔ بعد ازاں جنرل ضیاء الحق اور پھر محمد خان جونیجو نے

بھی اس کو اپنے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ (ص ۲۹۵)۔ محترمہ بے نظیر نے ایک جانب آئی ایس آئی کا سیاسی سیل ختم کرنے کا اعلان کیا، مگر دوسری جانب آئی بی کے سیاسی سیل کو مزید فعال بنانے کے لیے خزانے کا منہ کھول دیا (ص ۱۱۷-۱۱۸)۔ جنرل کلو نے اس سے سیاست دانوں کی وسیع پیمانے پر جاسوسی و مخبری کا کام لیا (ص ۲۴۲)۔

کتاب کا بیشتر حصہ (ص ۱۲۲-۲۳۴) "آپریشن مڈ نائٹ جیکالز" (۱۹۸۹) کی کیسٹوں کی حرف بہ حرف نقول پر مشتمل ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ "بے نظیر حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد کو کامیاب کرانے کی تیاریاں مکمل تھیں، مگر آخری مرحلے پر مخصوص حلقوں کے اشارے پر نواز شریف بھاگ گئے۔ انھوں نے اچانک ارادہ تبدیل کر لیا، یوں عدم اعتماد کی تحریک بری طرح ناکام ہوئی"۔ (ص ۱۱۹، ۲۴۷) یہ اس کتاب کا سب سے زیادہ عبرت ناک حصہ ہے، جس سے سیاست دانوں کے بکنے اور خریدنے والوں کی ذہنیت اور مول تول کی پستیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ "بے نظیر بھٹو نے بھارت اور امریکہ کو ایٹمی پروگرام کے بارے میں خفیہ معلومات دیں" (ص ۱۲۰) اور راجیو گاندھی نے بے نظیر کو آئی ایس آئی ختم کر کے اپنا اقتدار محفوظ رکھنے کا مشورہ بھی دیا (ص ۲۸۶) جواب میں بے نظیر کے "وزیر داخلہ اعتزاز احسن نے دہلی کے خفیہ دورے کے دوران ۱۱۲۳ سکھوں کی فہرست بھارت کے سپرد کی، جنھیں گرفتار یا ہلاک کر دیا گیا" (ص ۲۵۱)۔

منیر احمد بتاتے ہیں کہ سیکرٹری داخلہ فضل حق نے فروری ۱۹۷۷ میں بھٹو کو رپورٹ دی تھی کہ اسلامی جمعیت طلبہ کے راہ نماؤں نے خون سے لکھ کر عزم کیا ہے کہ وہ پاکستان قومی اتحاد کی کامیابی کے لیے اپنی جان کی بازی تک لگا دیں گے (ص ۶۵)۔

راقم ان دنوں جمعیت کے فیصلہ ساز اداروں کا باقاعدہ رکن تھا، اس لیے اس امر کی پرزور تردید کرتا ہے کہ جمعیت کے کسی کارکن یا لیڈر نے ایسا کوئی عہد و پیمان کیا تھا۔ یہ من گھڑت بلکہ لغو رپورٹ ایجنسیوں کے ذہن کی پیداوار تھی۔

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ خفیہ اداروں کے منہ کو قومی سیاست کا لہو ایسا لگا کہ اس کے نتیجے میں ان اداروں نے "حکومتیں بنوانے اور تڑوانے میں اہم کردار ادا کیا" (ص ۲۹۴) حالانکہ ان اداروں کا مقصد قومی سلامتی کا استحکام ہونا چاہیے۔

کتاب میں خوبیوں کے ساتھ چند خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اول: تکرار کا عیب، دوم: کہیں ضمیر واحد متکلم اور کہیں جمع متکلم، سوم: ۱۹۷۷ سے قبل کی برائے نام، اور ۱۹۸۸ کے بعد کی زیادہ تفصیلات دی گئی ہیں، اس لیے پہلے دور میں خفیہ اداروں کی سرگرمیوں پر تفصیلی مطالعے کی ضرورت باقی ہے۔

اگر کتاب زیادہ توجہ اور اطمینان کے ساتھ مرتب کی جاتی تو نہ صرف اس کی ضخامت کم ہوتی بلکہ نفس مضمون بہتر' اور اظہار بیان چست ہوتا۔ بہرحال یہ کتاب جو بیک وقت تحقیق وتجسس اور سازشی تانوں بانوں کے اظہار کا عمدہ نمونہ ہے' اپنے اوراق میں عبرت کا سبق لیے ہوئے ہے۔ اردو خواں طبقے کے لیے اس کا مطالعہ بالکل ایک نیا تجربہ ہے۔ (سلیم منصور خالد)

اورنگ زیب عالمگیر' ایک نیا زاویہ نظر: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد۔ ترجمہ: **فیضان رشید۔** ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ۔ صفحات: ۶۸۔ قیمت: ۱۵ روپے۔

بعض مورخین نے (جن میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی ہے) شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس کے مطابق عہد مغلیہ کا یہ "بدترین بادشاہ" ایک ظالم 'سخت گیر اور ہندو دشمن حکمران تھا۔ مندروں کی دولت سمیٹنا' انھیں توڑ کر وہاں مساجد تعمیر کرنا اور ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنانا اس کا وطیرہ تھا۔ اس کی تخت گیر پالیسیوں کی وجہ سے مغل سلطنت زوال پذیر ہوئی اور انگریزی راج کی راہ ہموار ہوئی۔ زیر نظر کتاب کے مصنف ایسے الزامات کو بے حقیقت قرار دے کر' ان کی تردید کرتے ہیں۔ انھوں نے تاریخ سے بہت سی ایسی مثالیں دی ہیں جن کے مطابق بہت سے ہندو حکمرانوں نے مندروں میں جمع شدہ لامحدود دولت کو اپنے اقتصادی مسائل کے حل یا محض ہوس زر کی تسکین کے لیے 'مندروں کو مسمار کرا دیا (ص ۱۱' ۱۲)

ڈاکٹر اوم پرکاش (پیدائش: ۱۹۵۰) پٹنہ یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ میں استاد ہیں۔ اصلاً یہ ان کا ایک توسیعی لیکچر ہے' جو دو بار ہندی زبان میں شائع ہوا' زیر نظر اس کا اردو ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر پرکاش کی رائے میں اورنگ زیب عالمگیر انتہائی باہمت' غیر معمولی بہادر' حوصلہ مند اور ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک شخص تھا۔ (ص ۲۲) اس نے اپنے پچاس سالہ دور حکومت (۱۶۵۸-۱۷۰۷) میں سادہ اور بااصول زندگی گزاری اور لہو ولعب سے یکسر دور رہا۔ (ص ۲۲) اس کے زمانے میں زیادہ تر مندروں کا تقدس برقرار رہا (ص ۱۸) بلکہ مندروں اور گردواروں کے لیے وظیفے مقرر اور جاگیریں وقف تھیں۔ (ص ۱۷) تاریخ کے اوراق میں وقف اراضیات سے متعلق کتنے ہی فرامین ملتے ہیں۔ مصنف کی تحقیق یہ ہے کہ عالمگیر نے صرف ایسے مندروں کو مسمار کیا' جو مرکز مخالف عناصر کے اڈے بن چکے تھے (بلکہ ایسی بعض مساجد بھی گرا دیں)۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی حکمت عملی کو سمجھنے کے لیے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ عالمگیر ایک بادشاہ تھا جسے ہر چیز سے زیادہ اپنے تخت و تاج کی بقا اور اپنی سلطنت کا استحکام عزیز تھا۔ (ص ۲۴) ڈاکٹر پرکاش کے بقول: "وہ شیعہ

مخالف ' باپ مخالف یا بھائی مخالف نہیں بلکہ گدی پسند تھا اور گدی کے لیے کوئی بھی چال 'سیاست کے لحاظ سے غلط نہیں ہوتی" (ص ۱) جہاں تک عالمگیر کی وفات کے بعد 'مغلیہ سلطنت کے انتشار اور ابتری کا تعلق ہے 'اس کے اسباب میں 'اس کے جانشینوں کی عیش کوشی 'اقتصادی بدانتظامی ' فوج کی تنظیم نو میں تکنیکی طریقوں سے غفلت شامل تھی۔

مصنف نے اورنگ زیب کی بعض کوتاہیوں کا بھی ذکر کیا ہے 'مگر بحیثیت مجموعی وہ ' اسے "ہندستان کے تین یا چار عظیم بادشاہوں میں سے ایک" سمجھتے ہیں۔ (ص ۵۶) ان کے الفاظ میں: "زمانہ تہذیب سے آج تک ہندستان کی تاریخ میں ایسا کوئی حکمران نظر نہیں آتا 'جس نے اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے معمولی سوالات اور معاملات کو بھی اہم سمجھ کر انھیں دور اندیشی کے ساتھ حل کرنے کی اس طرح کوشش کی ہو 'جیسی کہ اورنگ زیب نے"۔ (ص ۵۷)

زیر نظر مطالعہ 'تاریخ کے ایک بے لاگ مبصر اور ماہر کا ایک متوازن اور غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے۔ ایک ایسے دور میں 'جب بھارت میں مسلم مخالف رویے 'اندھے تعصب اور دشمنی کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں 'ایک ماہر تاریخ کا یہ تجزیہ قابل قدر ہے 'خصوصاً اس لیے بھی کہ تجزیہ نگار 'عقیدے کے لحاظ سے ہندو ہے۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

Islam and Economic Development : محمد عمر چھاپڑا۔
ناشر: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ و اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد۔
صفحات: ۱۶۶۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

ڈاکٹر چھاپڑا اسلامی معاشیات کے ماہر و محقق کی حیثیت سے علمی حلقوں میں خاصے معروف ہیں۔ ان کی انگریزی تصانیف اسلام کا معاشی نظام (۱۹۷۰) ایک منصفانہ زری نظام کی جانب (۱۹۸۵) اور اسلام اور معاشی چیلنج (۱۹۹۲) معاشی افکار کے میدان میں راہ نما اور راہ کشا کی حیثیت رکھتی ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس میں مصنف نے بڑے وسیع تناظر میں معاشی ترقی کے مختلف نظریات کا تجزیہ کیا ہے۔ عدم مداخلت کے کلاسیکی نظریے 'سوشلزم 'فلاحی ریاست اور آزاد معیشت کے نو کلاسیکی تصورات کے تحت ظہور میں آنے والے ترقیاتی نمونوں پر فکر انگیز بحث کرتے ہوئے 'چھاپڑا صاحب نے حیات و کائنات کے بارے میں ان نظریات کی مادہ پرستانہ بنیاد پر بھی کلام کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ مادہ پرستانہ سوچ نے اعلیٰ اخلاقی اقدار سے انسان کے معاشی عمل کو بے نیاز کر کے جس ڈگر پر ڈال دیا ہے 'اس سے انسانی خوشحالی کا ایسا ماحول کبھی وجود میں نہیں آسکتا جو ظلم و استحصال سے پاک ہو اور جہاں ترقیاتی عمل کے ثمرات کی تقسیم عدل و انصاف کی بنیاد پر ہو۔

کتاب کا دوسرا حصہ اپنی معنویت کے لحاظ سے 'بہت وقیع اور زیر نظر تصنیف کی جان ہے۔ اسے بجا طور پر اسلامی ممالک کا معاشی منشور قرار دیا جاسکتا ہے۔ چھاپڑا نے اسلامی ممالک کو درپیش معاشی مسائل مثلاً غربت' بے روزگاری' افراط زر' ارتکاز دولت' قرضوں کے بوجھ اور ادائگیوں کے عدم توازن کا تجزیہ کیا ہے اور ان خرابیوں کا بنیادی سبب یہ قرار دیا ہے کہ ان ممالک نے آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے بعد معاشی ترقی کے انھی نمونوں کو اپنایا ہے جو مغربی ماہرین کی مادہ پرستانہ سوچ کی پیداوار ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام سے روگردانی سے یہ ممالک اس کی برکات سے محروم ہوکر روز بروز گھمبیر مسائل کی دلدل میں دھنستے چلے جارہے ہیں۔

مصنف نے اس مقام پر ان مسائل کے تناظر میں اسلامی نظام معیشت کے بعض فکری اور عملی پہلوؤں کو بڑے خوبصورت اور موثر انداز میں واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی نظام معیشت ہی صرف پیدائش اور تقسیم و تبادلہ دولت کے میدان میں انسان کی معاشی جدوجہد کو اپنے اساسی عقائد اور اخلاقی اقدار کے ذریعے بے اعتدالیوں سے محفوظ کر کے معاشی ترقی سے بہرہ ور کرسکتا ہے۔

مصنف نے زرعی شعبے اور چھوٹے پیمانے کے کاروبار کو ترقی دینے کی ضرورت پر خصوصی زور دیا ہے۔

چھاپڑا صاحب کی سوچ پختہ' مطالعہ وسیع اور نقطہ نظر کو پیش کرنے کا انداز بہت موثر ہے مگر انھیں پڑھتے ہوئے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انسان کی معاشی جدوجہد قلت وسائل کا نتیجہ ہے۔ ہمارے نزدیک یہ لادین مغربی معاشی فکر کا اساسی مفروضہ ہے۔ اسلامی فکر تو کائنات اور اس کے وسائل کے بارے میں ایک ایسے ہمہ گیر اور قادر مطلق خالق کی موجودگی کو لازم قرار دیتا ہے جس کی ربوبیت کاملہ دنیا جہان کی احتیاجات کی نگران ہے۔ ضمن معیشت (Macro - economic imbalance) قلت وسائل سے نہیں بلکہ ذکر الٰہی سے اعراض کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال ہمیں معاشی جدوجہد کی بنیاد قلت وسائل کے بجائے کہیں اور ڈھونڈنی ہوگی۔

بحیثیت مجموعی زیر نظر کتاب اسلامی معاشیات کے موضوع پر ذخیرۂ کتب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب سمیت چھاپڑا صاحب کی تمام کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ (پروفیسر عبد الحمید ڈار)

On the Renaissance of the Muslim World : ڈاکٹر حفیظ الرحمن۔ ترجمہ: پروفیسر محفوظ علی۔ ناشر: نیر پبلی کیشنز اے ۵۴' بلاک ۱۳۔ سی گلشن اقبال کراچی۔

صفحات: ۱۴۲-قیمت: ۷۰ روپے۔

مسلم دنیا کی نشأت ثانیہ کے موضوع پر یہ تحریر دراصل بعد اسلام ' انسانیت کی علمی تاریخ ہے۔ بنیادی طور پر یہ مقالہ علامہ اقبال کے افکار کے مطالعے اور مسلم نشأت ثانیہ کے حوالے سے ان کا مقام متعین کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے نہایت عرق ریزی اور محنت سے مختلف علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقی اور عروج کو مستند حوالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پھر نشأت ثانیہ پر مسلمانوں کے زوال اور یورپ کے عروج کی داستان رقم کی ہے۔ اس مطالعے سے یہ متحقق ہوتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال علمی میدان میں ان کی کارگزاری پر منحصر ہے۔ آج اگر مسلمانوں کو از سرنو عروج حاصل کرنا ہے تو علمی برتری کے بغیر ممکن نہیں۔ علامہ اقبال کا یہی پیغام ہے کہ مغربی تہذیب یک رخی ہے ' اور انسانیت کو حقیقی فلاح اہل ایمان کی قیادت ہی میں نصیب ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے انھیں اپنا جمود توڑ کر ' اور اپنے خول سے باہر نکل کر اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج عالمی منظر پر احیاے اسلام کی جو لہریں ہل چل مچائے ہوئے ہیں ' وہ علامہ کی اسی فکر کا تسلسل ہیں۔

فاضل مصنف وفاقی گورنمنٹ کے اردو سائنس کالج کے پرنسپل ہیں۔ ماہر حیوانیات کی حیثیت سے نصف درجن درسی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پاکستان کی دستوری تاریخ پر بھی ان کی تصنیف کو ایک مقام حاصل ہے۔ زیر تبصرہ کتاب مصنف نے اردو میں لکھی تھی جسے پروفیسر محفوظ علی نے انگریزی دانوں تک پہنچانے کی خدمت انجام دی ہے۔ (مسلم سجاد)

نوائے حریت : سید علی گیلانی۔ مرتب: سلیم منصور خالد۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد۔ صفحات: ۲۵۶-قیمت: ۹۰ روپے۔

کشمیر کی آزادی صرف اہل کشمیر کا مسئلہ نہیں بلکہ پاکستان کی بقا اور عالم اسلام کی سربلندی کا مسئلہ ہے۔ اس جدوجہد میں جو قوتیں سرگرم ہیں ان میں "حزب المجاہدین" سرفہرست ہے۔ یہ جماعت اسلامی مقبوضہ کشمیر کا عسکری بازو ہے۔ اس کے قائد اور روح رواں سید علی گیلانی ہیں جو اپنی شجاعت ' استقامت اور سیاسی بصیرت کی بنا پر معاصر سیاسی راہ نماؤں میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ بھارتی حکومت نے انھیں قید و بند کی طویل مشقت و صعوبت میں مبتلا کیا لیکن ان کے عزائم میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنی بہادری سے بھارتی غرور کو خاک میں ملایا بلکہ قوت استدلال سے کشمیر پر بھارتی غاصبانہ قبضے کے جواز کو چیلنج کر کے عالمی سطح پر بھارت کے لیے ہزیمت کا سامان بھی کیا۔ قبل ازیں ان کی آپ بیتی "روداد قفس" منظر عام پر آچکی ہے۔ "نوائے حریت" اسی عظیم سالار حریت

کے منتخب خطوط ' مکالموں ' انٹرویوز اور اخباری کانفرنسوں وغیرہ کا مجموعہ ہے جن میں مسئلہ کشمیر کے حل سے متعلق مختلف سوالوں کا جواب دیا گیا ہے ' مختلف تجاویز کا تجزیہ کیا گیا ہے اور وادی کشمیر پر بھارتی مظالم کا پول کھولا گیا ہے۔ سید علی گیلانی نے اس ضمن میں عالمی رائے عامہ کو جھنجھوڑنے کی سعی کی ہے۔ ان کی مساعی کا ہدف یہ ہے کہ کشمیر کی تحریک آزادی بار آور ہو اور یہ مسئلہ ' فلسطین اور بوسنیا وغیرہ کی طرح بڑی طاقتوں کی شاطرانہ چالبازیوں کے زیر اثر پیچیدہ تر نہ ہو جائے۔ "نوائے حریت" کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر پاکستان نے اپنی ذمہ داریاں محسوس نہ کیں اور اس نے کشمیر کی جدوجہد آزادی میں اہل خطہ کو تنہا چھوڑنے کی حماقت کی تو اس کا نتیجہ پاکستان کے مستقبل کو مخدوش بنانے کی صورت میں بر آمد ہو گا۔ یہ کتاب جہاد کشمیر کی ایک پکار اور للکار ہی نہیں ' اس مسئلے کا ایک بصیرت افروز اور جذبہ انگیز مطالعہ بھی ہے۔ یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس سے مسئلہ کشمیر کی مختلف جہتیں واضح ہوتی ہیں۔ جناب سلیم منصور خالد نے "نوائے حریت" کی ترتیب میں خاصی محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے اپنی مطبوعات کی پیش کش کا جو بلند معیار قائم کیا ہے ' زیر نظر کتاب بھی اس کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

پاکستان کے نعت گو شعرا ' جلد اول۔ مرتب: سید محمد قاسم۔ ناشر: ہارون اکیڈیمی ۲۹۴/۸ محمد مصطفیٰ کالونی ' بلاک ایم سیکٹر ۲/۱-۱۱ اورنگی کراچی نمبر ۱۴۔ صفحات: ۲۶۸۔ قیمت: ۲۰۰ روپے۔

گذشتہ ربع صدی کے دوران میں نعت رسول ﷺ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایسے شعرا کی کمی نہیں جو نعت کے حوالے سے اپنی شناخت پر نازاں ہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعے ہمارے ادبی سرمائے میں وقیع اضافہ تصور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اصحاب ذوق نے نعت گو شعرا کے تذکرے اور انتخاب بھی مرتب کیے ہیں۔ جناب سید محمد قاسم کا مرتبہ زیر نظر مجموعہ اسی نوع کی ایک سعی جمیل ہے۔

یہ مجموعہ ایک بڑے منصوبے کا آغاز ہے جس کی تکمیل کئی جلدوں میں ہوگی۔ اس پہلے حصے میں ایک سو پاکستانی نعت گو شعرا کے حالات اور ہر شاعر کی دو منتخب نعتیں شامل ہیں۔ اس تذکرے میں صرف ان نعت گو شعرا کو نمایندگی ملی ہے جن کے ایک یا ایک سے زیادہ نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ہر نعت گو کے لیے تین صفحات مخصوص ہیں۔ پہلے صفحے پر شاعر کا مختصر ذکر ہے اور دو صفحوں پر نمونہ کلام۔ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ صرف وہی نعتیں درج تذکرہ ہیں جن میں سرور کائنات ﷺ سے اظہار عقیدت و محبت میں حدود شریعت کا خیال رکھا گیا ہے۔ تذکرے کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے۔

آغاز میں نعت رسول ؐ کے موضوع پر بعض وقیع اور معلومات افزا تحریریں بھی شامل ہیں اور کتاب کے آخر میں کتابیات کی شمولیت سے تذکرے کی تحقیقی نوعیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ پاکستان کے نعت گو شعرا کے سوانحی خاکوں اور منتخب نعتوں پر مشتمل یہ تذکرہ 'نعت گوئی کے رجحان کے فروغ اور معیار میں اضافے کا موجب بنے گا۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

جینٹل مین اللہ اللہ : (لیفٹیننٹ کرنل) اشفاق حسین۔ ناشر: ادارہ مطبوعات سلیمانی' رحمان مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۳۲۶۔ قیمت: ۸۴ روپے۔

گذشتہ چند دہائیوں میں اردو سفرنامہ تیزی سے مقبول ہوا ہے' مگر اس کے ساتھ اس کا معیار بھی متاثر ہوا ہے۔ بعض سفرنامے تو محض چٹ پٹی داستانوں پر مشتمل ہیں۔ ان کے ردعمل کے طور پر چند ایسے سفرنامے شائع ہوئے' جن میں جغرافیائی معلومات پر زور دیا گیا ہے۔ یہ قاری کے لیے محض خشک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اشفاق حسین نے "جینٹل مین اللہ اللہ" میں درمیانی راہ اپنانے کی کوشش کی ہے۔

یہ سفرنامہ بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی حصے میں سعودی عرب کے فوجی کیمپ میں گزرے دنوں کی سرگذشت ہے۔ اس میں مصنف کی سابقہ دو کتابوں "جینٹل مین بسم اللہ" اور "جینٹل مین الحمدللہ" کا رنگ غالب ہے۔ یہ معلومات دلچسپ ہیں۔ خصوصاً یہ کہ ایک انسٹی ٹیوٹ میں سیکھی ہوئی زبان کو جب عملی طور پر آزمایا جائے تو کیسی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا حصہ حج کے تاثرات پر مبنی ہے۔ اشفاق حسین نے یہ حصہ انتہائی احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس میں جہاں عقیدت و تقدس کا پہلو ہے' وہاں مصنف نے حجاج کی کوتاہیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ تیسرا حصہ سعودی عرب کی سیاحت کے احوال پر مشتمل ہے۔ یہاں مصنف نے تاریخی واقعات کا سہارا لے کر بات کو آگے بڑھایا ہے۔ اس طرح ان مقامات کی تاریخی حیثیت اجاگر ہوتی ہے اور قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ آل سعود کیسے برسراقتدار آئے' اور جدید مملکت سعودیہ کا ارتقا کیسے ہوا؟

جناب اشفاق حسین کا اسلوب بہت رواں' شگفتہ اور دلچسپ ہے' اور قاری کو گرفت میں لیتا ہے۔ کتاب میں ضروری نقشے بھی شامل ہیں اور موقع محل کے مطابق آیات' احادیث اور روایات کے استعمال نے نثر کو باوقار اور معتبر بنا دیا ہے۔ کتاب کا اشاعتی معیار اطمینان بخش ہے۔ (محمد عامر رانا)

مدیر کے نام

عبد القدیر سلیم ' کراچی

'دینی مدارس کا نظام تعلیم' (جولائی ۹۵) ایک نہایت اہم مسئلہ پر فکر اور ترمیم عمل کی دعوت دیتا ہے۔ کاش ہمارے دینی مدارس کے کرتا دھرتا مولانا قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کی اس فکر میں خود بھی مبتلا ہوں جو انھیں دین کا درک رکھنے والے نوجوانوں میں علوم جدیدہ کی تعلیم کے بارے میں تھی اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانی "اس تعلیمی نصب العین کا چرچا لوگوں میں بعد کو نہیں کیا گیا تھا حتیٰ کہ ---- سوچنے والے کی بات شاید سوچنے والے کے ساتھ ہی دفن ہو گئی"۔ آج بڑے شہروں میں ایسے مدارس ہیں جن کے احاطے (کیمپس) جامعات کا مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان کے بجٹ کروڑوں روپے سالانہ کے ہیں۔ وہاں کیوں روایتی دینی تعلیم کے ساتھ علوم عمرانی' (روایتی) طب و جراحت اور فنون کی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔

بشیر جمعہ کے مضمون کی افادیت سے انکار نہیں 'لیکن اطلاقی نفسیات اور ڈیل کارنیگی کے سے مضامین کے لیے شاید ترجمان مناسب وسیلہ نہیں۔

اشارات کی حیثیت اب رسالے کے اداریے کے درجے سے اوپر ایک تحقیقی مطالعہ کی ہو گئی ہے۔ اگرچہ ہر اداریہ ہی اپنے موضوع کا کماحقہ احاطہ کرتا ہے لیکن مجھے گستاخ رسول کی سزا سے متعلق تحقیقی مطالعہ بہت اچھا لگا۔ اس کا انگریزی ترجمہ اور اشاعت ہمارے انگریزی ذوق طبقہ کے لیے جو 'لسانی رکاوٹ' کا شکار ہیں 'بلکہ' اہل مغرب کے لیے بھی مفید ہو گا اور وہ ہمارے جذبات اور موقف سے بہتر طور پر آگاہ ہو سکیں گے۔

عبد الغنی 'سعودی عرب

مذاکرہ (جولائی ۹۵) اپنی مثال آپ ہے۔ ہو سکتا ہے اس جرات رندانہ پر بعض لوگ آپ کو قابل گردن زدنی قرار دیں لیکن میری رائے میں آپ نے ایک بہت ہی اہم خدمت انجام دی ہے۔ یقین ہے کہ ذمہ داران اسے پڑھ کر تبدیلی کے لیے سوچنے پر مجبور ہوں گے۔

پروفیسر غلام اعظم ' ڈھاکہ

اپنے مضمون (کارکنوں کے اوصاف مئی ۹۵) کو میں نے تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے ۷۔ نکات کا عنوان دیا تھا۔ درحقیقت ہر نکتہ صفت نہیں ہے۔ بہرحال مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جون کا شمارہ اوائل ماہ

میں ہی مل گیا تھا۔ میں نے پورا پڑھ ڈالا۔ ترجمان القرآن کے لیے آپ کی بہترین کوششیں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ الحمدللہ کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے بہتری ہوئی ہے۔

صباحت مظہر 'لاہور

امت مسلمہ اس وقت جس تباہ حالی کا شکار ہے اس میں نقاب کے مسئلے پر بحث کی گنجایش نہیں۔ ایک طرف مسلمان لڑکیاں دوپٹہ پھینک دینے کی سرحد پر کھڑی ہیں اور دوسری طرف ہمارے اہل علم کا یہ حال ہے کہ جو لڑکی نقاب نہ لے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے "یہ پردہ کیوں نہیں کرتی؟" گویا اس نے پردہ کیا ہی نہیں۔ نقاب کے معاملے پر بڑے بڑے اماموں میں اختلاف ہوا ہے۔ اس کی یہی حیثیت باقی رہنے دیجیے۔ نقاب نہ پہننے والوں پر انتہا درجے کی منفی رائے قائم کرنے سے گریز کیجیے۔ آخر زینب الغزالی تحریک اسلامی مصر کی اس قدر باہمت اور ممتاز کارکن ہیں' وہ بھی نقاب نہیں لیتیں۔

چہرے کے پردے کے حق میں دلائل دینے کے لیے سیکڑوں صفحات سیاہ کیے جا چکے ہیں۔ عورتوں کے لیے مسلسل احتیاطیں اور پابندیاں تجویز ہوتی ہیں اور عورت ہے کہ سمٹتی چلی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے عام اخلاقی بگاڑ ہے' فتنے کا دور ہے' میرا سوال ہے کہ مرد کی اصلاح کے لیے کتنی کوششیں کی گئی ہیں؟ مردوں کے غض بصر کے حکم کی تعمیل کے لیے ان پر کتنا زور دیا گیا۔

محمد ندیم 'لوند خوڑ ضلع مردان

فروری ۹۵ سے باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ میں اسے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ ہر ماہ اس کا انتظار ہوتا ہے۔ ترجمان القرآن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس کے مستقل سلسلے دل و روح کو اطمینان بخشتے ہیں۔ مضامین بہت عمدہ اور اشارات مثالی ہوتے ہیں۔ بعض مضامین میں الفاظ بہت مشکل تھے۔ جتنے آسان الفاظ اور زبان استعمال کریں گے' اتنا ہی زیادہ لوگ ترجمان شوق سے پڑھیں گے۔

حبیب اللہ خان 'کوئٹہ

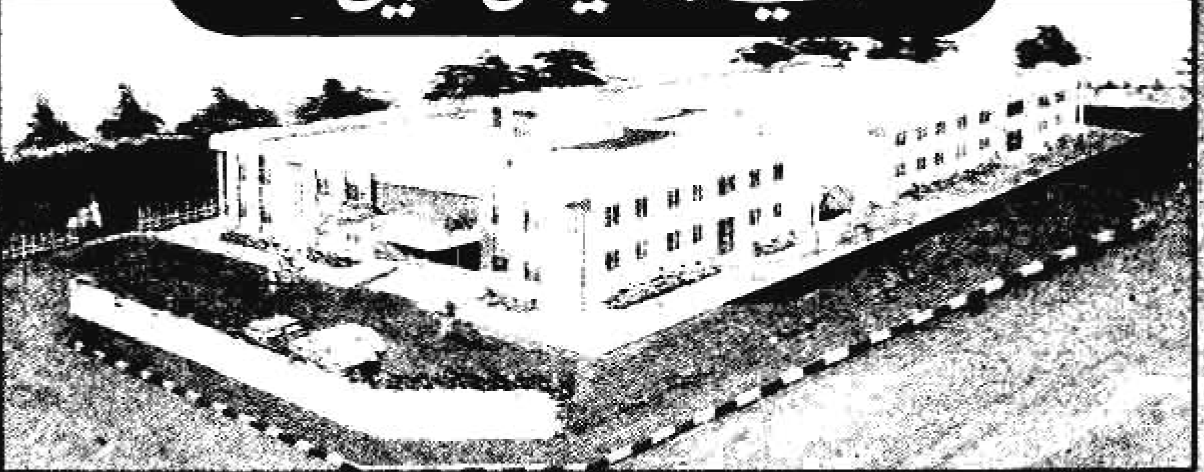
انتہائی شوق اور باقاعدگی سے تمام مضامین کا مطالعہ کرتا ہوں۔ مجموعی طور پر معیار دن بدن بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ خدا آپ کی محنت میں برکت و وسعت عطا فرمائے۔

عبیداللہ خلیل

'دینی مدارس کا نظام تعلیم' اور اسلام اور جمہوریت (جولائی) نے بہت متاثر کیا۔ دینی مدارس کے لیے مشورے اخلاص پر مبنی ہیں لیکن انگریزی یا سائنس شامل کرنا میرے نزدیک ان سے اعلان جنگ ہے۔ اس کے لئے علیحدہ یونی ورسٹیاں اور کالجز موجود ہیں۔ وہاں وہ اپنے کمال دکھائیں۔

اور جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی گویا اس نے سارے انسانوں کی جان بچائی (القرآن)

آئیے کار مسیحائی کریں



الخدمت ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) نے پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے تعاون سے کراچی کے پسماندہ علاقے ضلع غربی میں اورنگی ٹاؤن، قصبہ، علیگڑھ کالونی، بنارس اور قرب وجوار میں رہائش پذیر دکھی لوگوں کے لئے جدید سہولیات سے آراستہ ۱۰۰ بستروں کے ہسپتال کا منصوبہ تشکیل دیا ہے، اس منصوبے کے تعمیراتی اخراجات کا تخمینہ دو کروڑ روپے ہے۔

الخدمت ہسپتال

بالمقابل اورنگی ٹاؤن تھانہ، اورنگی ٹاؤن کراچی

فون: 6668893 - 6668894 فیکس: 6652883

اپنے عطیات بنام الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ) اکاؤنٹ نمبر 6/6 مسلم کمرشل بینک خداداد کالونی برانچ میں جمع کروائیں

الخدمت ویلفیئر سوسائٹی کراچی (رجسٹرڈ)

عطیہ اشتہار۔ پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کراچی۔

قرآن مجید مترجم

(بین السطور ترجمہ)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

سائز ۲۰×۳۰ ‘ صفحات ۹۳۷ ‘خوبصورت جلد
۸

ہدیہ -/۲۰۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ ‘اردو بازار - لاہور

ترجمہ قرآن مجید (مع مختصر حواشی)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

اس میں مترجم نے قرآن حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں

تفہیم القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سائز ۲۳×۳۶ ‘ صفحات ۱۵۸۴ ‘خوبصورت جلد
۱۶

ہدیہ: بائبل پیپر:- /۳۰۰ روپے ولایتی پیپر:- /۲۵۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ ‘اردو بازار - لاہور

REGD. NO. L 5340

PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE